

گلبانگِ حیات

زندگی ہے امیںؔ وہی ناکام
جو حقیقت سے آشنا نہ ہوئی

امینِ حزیں سیالکوٹی

ترتیب اوّل — اکتوبر ۱۹۵۰ء — قیمت دو روپے ۲/

سول ایجنٹ

اُردو اکیڈمی پنجاب لوہاری گیٹ لاہور

انتساب

پیرِ ہندی حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ
کی حیات پرور یاد سے

امینِ حزیں

مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ۔ لاہور
ناشر خان بہادر خواجہ محمد مسیح پال امینِ حزین شہر سیالکوٹ

گلبانگِ حیات

از قلم جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب مدظلہٗ

سیالکوٹ کی مردم خیز زمین سے جس کو ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی زادِ بوم ہونے کا فخر حاصل ہے ایک اور فاضل ادیب اپنا اردو کلام دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے کو ہے ادبی حلقوں میں اس کا نام "امین حزیں" ہے اور ویسے خان بہادر خواجہ محمد مسیح پالؔ[۱]۔ میرا خیال ہے کہ "حزیں" کو "امین" کا ہم قافیہ پا کر انہوں نے حزیں تخلص بنا لیا ورنہ اُن کا کلام غم و حزن کی جگہ نوید جوش ہے اور شوق عمل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اقبال کی شاعری کا جو گہرا اثر اُن کے دَور کے شاعروں پر ہوا ہے۔ کلامِ امین اس اثر کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ہموطنی کے علاوہ جو بات دونوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں نے اپنی عمر کی ابتدا میں ایک ہی استاد سے فیض پایا ہے۔ دونوں شمس العلما مولوی سید میر حسن صاحب مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مولوی صاحب کو اپنے شاگردوں میں عربی فارسی اور اردو ادبیات کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں خاص مہارت تھی۔ وہ نہایت خاموشی سے علمی خدمات انجام دیتے تھے۔ اور کبھی کسی اعزاز یا مفاد کے حکومت سے طالب نہیں ہوئے۔ جب انہیں خطاب شمس العلما ملا۔ تو انہیں خود حیرت ہوئی کہ اس خطاب نے انہیں کیسے ڈھونڈھ لیا۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہ خطاب سر اقبال کی ایک اتفاقی گفتگو کا نتیجہ تھا۔ جو ان کے اور پنجاب کے گورنر صاحب کے درمیان ایک مرتبہ ہوئی۔ اُن دنوں کسی عالم یا مصنّف کو خطاب دینے کا معاملہ زیر غور تھا۔ گورنر نے سر اقبال سے پوچھا کہ آپ کسی ایسے عالم کو جانتے ہیں۔ جو اس امتیاز کے لئے موزوں ہو۔ سر اقبال نے اپنے استاد کا نام لیا۔ گورنر نے دریافت کیا "اُن کی تصانیف کون کون سی ہیں"۔ اقبال نے جواب دیا "ایک تو میں ہی ہوں"۔ اس پر گورنر صاحب نے مسکرا کر کہا "یہ تصنیف تو خوب ہے"۔ اقبال نے کہا اس قسم کی کچھ اور بھی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ کتابیں بناتے ہیں مولوی صاحب کتابوں کے مصنّف بناتے ہیں"۔ یہ جواب کارگر ہوا اور جو فہرست خطابات اس گفتگو کے بعد شائع ہوئی اُس میں مولوی صاحب کا نام آفتابِ علم بن کر چمکا۔

۱۔ "پال" ایک کشمیری گوت ہے۔ خواجہ صاحب کا خاندان بھی سر اقبال مرحوم کے خاندان کی طرح کشمیر سے آکر پنجاب میں آباد ہوا تھا۔

ب

مولوی مہر حسن صاحب کی جو "اس قسم کی کچھ اور" تصانیف ہیں۔ اُن میں سے ایک جناب امین حزین سیالکوٹی ہیں۔
آپ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد خواجہ احمد دین مرحوم بڑے ذی علم بزرگ تھے۔ آپ نے سیالکوٹ کے مشن ہائی سکول میں اور بعد میں وہاں کے مشن کالج میں تعلیم پائی۔ پہلے ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا۔ مگر سائنس سے طبیعت کی مناسبت نہ پا کر ملازمت اختیار کی۔ اور گلگت میں پولیٹیکل محکمے کے دفتر میں ملازم ہو گئے وہیں سے ترقی کرتے کرتے خطاب خان بہادر پایا۔ زمانۂ ملازمت میں بھی علمی مشاغل کا شوق رہا۔ اور اب سبکدوش ہو کر ادب اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں آپ کا اردو کلام بہت سے رسائل میں طبع ہوتا رہتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔
امین کو اپنی موزونیٔ طبع کا احساس تو زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا۔ اور کبھی کبھی اردو غزل لکھتے تھے ۱۹۰۲ء میں اُنکی ایک غزل لکھنؤ کے "پیام یار" میں چھپی اور پسند کی گئی اس وقت ان کو خیال ہوا کہ اقبال کی شاگردی کریں اُن سے ملے اور اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا "شاعری خدا داد چیز ہے اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے۔ تو مشقِ سخن کئے جایئے اور اساتذہ کا کلام بغور پڑھیئے۔ تاکہ کان بحروں سے مانوس ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم باقی نہ رہے"۔ اُس دن سے امین اس مشورے پر عامل ہیں ابتدا میں مولوی ظفر علیخاں اور مولینا محمد علی مرحوم کے رنگ سے متاثر تھے۔ لیکن بعد ازاں ان کی طبیعت پر اقبال کا رنگ بالکل چھا گیا۔
گذشتہ جنگِ عظیم میں قوموں کا بننا اور بگڑنا دیکھ کر امین کے دل میں یہ خیال مستحکم ہو گیا کہ جو قومیں بڑھتی ہیں وہ اس لئے بڑھتی ہیں کہ اُنکا "یقین" اپنے متعلق مضبوط ہوتا ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ جو ارادہ وہ کرلیں گی ہمت اور محنت اسے پورا کر سکتی ہے اور جن قوموں کا "یقین" کمزور اور ناقص ہے۔ انکے کام بھی ادھورے اور نامکمل ہیں۔ اور یہی اصول افراد پر حاوی ہے کیونکہ قومیں افراد کا مجموعہ ہے۔ اس نظریئے کو سامنے رکھکر امین نے ۱۹۲۶ء میں فارسی ابیات اور قطعات لکھے اور اُنکے مجموعہ کا نام "نوائے دل" تجویز کیا۔ اسکے مسودات وقتاً فوقتاً فارسی کے مشہور استادِ غزل مولینا گرامی مرحوم کے پاس بھیجے گئے۔ انہوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار متعدد خطوط میں کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کے عالی خیالات سے بہت خوش ہوں"۔ کیا اچھی رباعی ہے ؎

یقیں طوفاں بر آرد از تنورے ، یقیں گلزار سازد گلخنے را
یقین است اے مسلماناں یقیں است کہ از یک دانہ آرد خرمنے را

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

"آپ کی رباعیاں دلآویز ہیں۔ حکیمانہ مضامین سے لبریز ہیں"۔

اس کے بعد یہ قطعات مشورۃً جناب نیاز فتحپوری کو دکھائے گئے۔ اور انہوں نے ان الفاظ میں انکی داد دی :-

"اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ آپ کے ادبیات (قطعات) بالکل جدید چیز ہیں۔ اور انکی اشاعت از بس ضروری ہے۔ بعض بعض مقامات پر آپ نے اس حسن کے ساتھ اپنے مطلب کو ادا کیا ہے۔ کہ ذوقِ سلیم وجد میں آجاتا ہے آپ کے نظریہ سے میں بالکل متفق ہوں اور اس کی اشاعت کا مؤید"

افسوس ہے کہ گرامی کی تعریف اور نیاز فتحپوری کی تائید کے باوجود یہ قطعات ابھی تک شائع نہیں ہوئے مگر میں نے انکا ذکر یہاں اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ یہ قطعات اس شاعری کی اساس ہیں۔ جو اس اردو مجموعہ میں موجود ہے جو اب شائع ہو رہا ہے۔ اور جس کا نام "گلبانگِ حیات" رکھا گیا ہے

جو مقصد مصنّف کے پیشِ نظر ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ نام موزوں ہے۔ پہلی ہی غزل یوں شروع ہوتی ہے ؎

لائے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام کر
جن میں ہو کیفِ زندگی۔ بہرِ خدا وہ کام کر،
طورِ حیات سے اُڑا "جذبۂ زیستن" کی آگ
جب کہیں جا کے نسبتِ زندگی دوام کر

ایمن نہ صرف "زندگی" کی اہمیت جتاتا ہے۔ بلکہ اُسے پُر مقصد اور مفید بنانے کا مؤید ہے۔

ایک مرحوم دوست کی یاد میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ جن کا مطلع یہ ہے ؎

زندگی زیرِ فلک بازیٔ طفلانہ نہیں　　کارخانہ ہے جہاں کوئی طرب خانہ نہیں

اسی مضمون کو ایک اور نظم میں یوں ادا کیا ہے ؎

حیات زیرِ فلک ہماری نہیں ہے بچوں کا کھیل ہمدم!
ہے کارخانے میں قدر اس کی جو کارکن ہے۔ کارواں ہے

زندگی کے سمندر میں کنارے کی جگہ طوفان کی جستجو۔ اقبال کو بھی پسند ہے اور اُن کے معنوی شاگرد کو بھی۔

امین کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

ہے طوفان در بغل جس موجِ مضطر کا ہر اک قطرہ
اُسے کیوں جستجو ہو راحتِ آغوشِ ساحل کی

اقبال کا سب سے مختص مضمون "خودی" کی ترقی ہے۔ امین نے جب نوائے دل میں "یقین" پر زور دیا۔ تو وہ "یقین" بھی عملاً اسی خودی کا مترادف تھا جو اقبال کی تصانیف میں ایک خاص اصطلاح بن گئی ہے اور بہت سے معانی رکھتی ہے۔ امین اپنے اشعار میں اس اصطلاح کا مطلب عام فہم الفاظ میں واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک غزل کے یہ چند شعر سلیس بھی ہیں اور پُر مضمون بھی ؎

دلیلِ راہ "چراغِ خودی" اگر ہو جائے | قدم مسافرِ ہستی کا تیز تر ہو جائے
مقامِ عالیٔ عرفانِ ذات ہے۔ معنی | خودی یہی ہے کہ تجھ کو تری خبر ہو جائے
تری نگاہ کو رفعت کا خوف ہے ورنہ | نہیں محال کہ تو زیر سے زبر ہو جائے

ایک اور مقام پر ایک رباعی میں خودی کے نکات بہت عمدگی سے بیان کئے گئے ہیں ؎

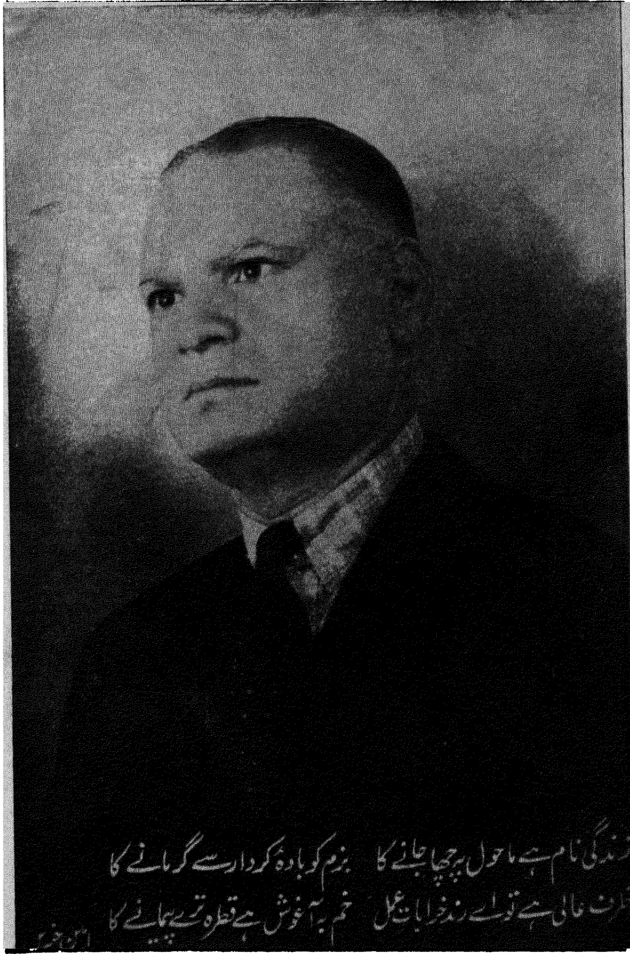
دریا کے تموّج میں دریا کی خودی پنہاں | گوہر کے تجمّل میں قطرے کی خودی نازاں
ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو | مہر و مہ و انجم میں ہے اُن کی خودی تاباں

یہ اشعار تو "خودی" کی براہِ راست تفسیر کر رہے ہیں۔ مگر کہیں کہیں اسی مقصد کے ساتھ ساتھ شانِ تغزل بھی خوب نبھا ہی گئی ہے۔ مثلاً یہ دو شعر دیکھئے ؎

دردِ دل اصل میں تھا ولولۂ جوشِ نمو | جس سے یہ دانۂ ناچیز شجر ہو کے رہا
عشق میں جوشِ عبودیت دل رُک نہ سکا | کہیں آنسو۔ کہیں نالہ کہیں پر ہو کے رہا

امین حزیں کے خمخانہ سخن سے یہ چند جام مُفت نذر ہیں۔ مے باقی کے طالب اور چاہیں تو خمخانہ سے طلب کریں

عبد القادر


ندگی نام ہے ماحول پر چھا جانے کا   بزم کو بادۂ کردار سے گرمانے کا
رف عالی ہے تو اے رند خرابات عمل   خم بہ آغوش ہے قطرہ ترے پیمانے کا

فاتحۃ الکتاب

لالے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام کر
جن میں ہو کیفِ زندگی بہرِ خدا وہ کام کر
طورِ حیات سے اڑا ’’جذبۂ زیستن‘‘ کی آگ
جب کہیں جا کے زینتِ زندگیٔ دوام کر
پہلے یہ سوچ دام کے توڑنے کی سکت بھی ہے
بعد کو دل میں خواہشِ دانۂ زیرِ دام کر
تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات
بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کر

حیف سمجھ رہا ہے تو اپنی جھجک کو محتسب
میکدۂ حیات میں شوق سے مے بجام کر

نقش نوی نہیں ہے تو صفحۂ روزگار پہ
مٹنے سے گر نہیں مفر مٹ ہی کے اپنا نام کر

بندۂ خواہشات کو کہتا ہے کون "عبدِ حر"
چاہئے حریت اگر دل کو امیں غلام کر

---

۱۹ ستمبر ۱۹۳۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُعا

گدازِ روح یعنی رخصتِ پیکار مل جائے! فروغِ مہر یعنی وسعتِ پندار مل جائے!
مرا سوزِ دروں ہو سر بسر اک آتشیں نالہ! مری طبعِ رسا کو شغلِ موسیقار مل جائے!
تخیل کو مرے مولا شہیدِ جستجو کر دے! مرے پائے طلب کو برق کی رفتار مل جائے!
مری جو آرزو ہو رزمِ ہستی کا مرقع ہو! مری تیغِ خودی کو جوہرِ کردار مل جائے!
عقابِ جستجو کو شہپرِ جبریل دے یارب! شکارِ آہوانِ وادیٔ اسرار مل جائے!
یہی ہے زندگی ہو موت سے بیگانہ دل اپنا یہی ہے حریت آزادیٔ افکار مل جائے!

امیں کندہ ہے جس پر "انتم الاعلون"[1] کا وعدہ
ہمیں ایقان کی وہ تیغِ جوہردار مل جائے

[1] آیہ شریفہ انتم الاعلون ان کنتم مومنین

۹ اپریل ۱۹۳۷ء

جوانی کجا گئی!

تصوّر کے انداز کو لے گئی تو
تخیّل کی پرواز کو لے گئی تو
تکلّم کے اعجاز کو لے گئی تو — کجا ئی جوانی! جوانی کجائی!

۲

رگوں میں وہ برقِ رواں ہی نہیں ہے
مسرّت کا لب پہ نشاں ہی نہیں ہے
کرے کیا طبیعت جواں ہی نہیں ہے — کجائی جوانی! جوانی کجائی!

۳

چمن تھا کبھی میکدہ بیخودی کا
گلِ تر مئے ارغواں کا پیالہ
مگر اب تو بادِ صبا بھی ہے کانٹا — کجائی جوانی! جوانی کجائی!



کہاں اب جوانی کا وہ عہدِ زرّیں
مری شادمانی کا وہ عہدِ زرّیں
مری کامرانی کا وہ عہدِ زرّیں　　کجائی جوانی! جوانی کجائی!



وہ دنیائے جذبات کی دل فریبی
وہ ارض و سمٰوات کی دل فریبی
وہ دن کی کشش رات کی دل فریبی　　کجائی جوانی! جوانی کجائی!



جگر میں تڑپ ہے نہ لب پر ترانہ
فسانہ ہوا عہدِ زرّیں فسانہ
کہ پیری و صد عیب" کا ہے زمانہ　　کجائی جوانی! جوانی کجائی!

۲۳ر مئی ۱۹۳۳ء

غزل

اس غزل میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بلند پایہ غزل کے مفہوم کو

اُردو جامہ پہنایا گیا ہے

آدمی بن آدمی پہلے خدا مل جائیگا
آپ اپنا آشنا ہو آشنا مل جائیگا

شاخِ تر ہی تجھ کو دے سکتی ہے آبِ زندگی
اس صبا سے اے گلِ پژمردہ کیا مل جائیگا

خونِ دل ہی کے قطرے ہیں جنہیں کہتے ہیں مشک
تجھ کو اے آہو حرم ہی میں خطا مل جائیگا

فقر کا دعویٰ غلط ہے تختِ کسریٰ کے بغیر
گوشۂ عزلت میں کیا اسے بینوا مل جائیگا

کیا بتاؤں کیا ہوئے وہ خوں شدہ نالے مرے
لالہ زارِ دشت سے ان کا پتا مل جائیگا

عقل کے اندھے کہیں سے ڈھونڈ روشن دل کوئی
اُس کے ہاں سے تجھ کو تیرا مدعا مل جائیگا

میں قلندر ہوں جہاں بینی کرامت ہے مری
جز نگہ تجھ کو ہوس مجھ سے کیا مل جائے گا

۱۲ر جولائی ۱۹۳۳ء

افکار

پسلی پھڑک اُٹھے نظرِ جبرئیل کی — دیکھے اگر وہ میرے جہانِ خیال کو
تسبیح خوانِ روزِ ازل کو کہاں نصیب؟ — کہتے ہیں دل جس آئینۂ بے مثال کو

۲

میدانِ کارزار ہے دل حُسن و عشق کا — جو بات اس میں ہے مہ و خورشید میں نہیں
زہرہ کی چشمکوں میں پیامِ جنوں کہاں! — یہ دعوتِ گداز فقط دید میں نہیں

۳

ہے دل کے باب میں فلکِ پیر کو حسد — یہ صحبتیں نصیب کہاں اُس غریب کو؟
فطرت کا التفاتِ فراواں ہے مجھ پہ کیوں؟ — ہے کھا گئی یہ بات ہمارے رقیب کو

۴

آلودہ مہر و مہ کی چمک سے ہو کیوں نظر — افلاک سے پرے کے ہیں جلوے نگاہ میں
مجبورِ بے بسی ہی سہی میں ابھی! مگر — ہے لطفِ زندگی مری ناکردہ آہ میں

۸ ستمبر ۱۹۳۳ء

آدابِ حضور

کلیم ہو کے رہے ہوش میں نہ موسئے بھی
مگر یہ شیوۂ الفت ہے قابلِ تقلید

حضورِ یار میں غش کھا کے خاک پر گرنا
ثنائے حسن یہی ہے اور یہی تمجید

۲

جنابِ حسن میں شاعر بھی کیوں خموش نہ ہو؛
جمالِ یار کا ہنگامہ خود ہی کیا کم ہے؛

یہیں زباں بھی جبینِ نیاز ہے یکسر
حریمِ ناز مقامِ سجودِ پیہم ہے

۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

غزل

لبریزِ نگہ دل کو جلووں کا تقاضا ہے
نظارے کی حسرت ہے دیدار کا سودا ہے

چھپتے ہو تو مجھ سے ہی پردہ ہے تو مجھ سے ہی
کیا مہر سے چھپتے ہو کیا ماہ سے پردہ ہے؟

مہجور کے پہلو میں اک درد بھرا دل ہے
اک درد بھرا دل ہے یا درد کی دنیا ہے!

کیوں آتشِ فرقت میں دن رات جلاتے ہو؟
میرے ہی لئے دنیا دوزخ ہے کہ دنیا ہے؟

میں در سے ترے اٹھکر جاؤں تو کہاں جاؤں؟
ملجا ہے تو ہی میرا تو ہی مرا ماوا ہے

مجبورِ محبت ہوں تسلیم کا خوگر ہوں
مختار ہیں، مالک ہیں جو آپ کا منشا ہے

ہر شعر اُبیں اِس کا تصویر ہے فرقت کی
تیری یہ غزل گویا ہجراں کا مرقع[1] ہے

۱۵ جنوری ۱۹۳۲ء

[1] آج کل صوتی لحاظ سے ایسے قوافی کا استعمال جائز سمجھا جا رہا ہے۔

مقامات

اگر مہر بن کر چمکنا ہے مشکل
تو دنیا میں مہتاب ہی بن کے چمکو
اگر رعد بن کر کڑکنا ہے مشکل
تو پھر برقِ بیتاب ہی بن کے چمکو

۲

اگر دل تمہارا سمندر نہیں ہے
بہو بن کے تم رودِ گنگا کا دھارا
اگر تم میں ہیرے کا جوہر نہیں ہے
خدارا بنو سنگِ خارا خدارا!

۳

گر انسان بننا میسر نہیں ہے
جیو آدمی بن ہی کے تم ، کم از کم
خدا پر تمہارا یقیں گر نہیں ہے
تمہاری "خودی" تو نہ ہو گم ، کم از کم

۲۳ جنوری ۱۹۳۴ء

شعور و وجدان

چشمِ ظاہر بیں تو کہتی ہے کوئی ساقی نہیں
اور ان مٹی کے مٹکوں میں مے باقی نہیں

یہ مہ و خورشید و انجم کیا ہیں "گردش زادہ" ہیں
"واہمہ کہتا ہے جامِ نور ہیں پر بادہ ہیں

اتفاقی ہے یہ ساری کائناتِ میکدہ
اور طلسماتِ منظّم "ممکناتِ میکدہ

ہے عمل دنیا میں اک قانونِ عالمگیر کا
جو محرک ہے یہاں تخریب کا "تعمیر کا"

۲

میرے وجداں کا مگر پیغام ہی کچھ اور ہے
چشمِ باطن کی نظر کا نام ہی کچھ اور ہے

گر پسِ پردہ کوئی معشوقِ بے ہمتا نہیں
روح کیوں بےچین ہے؟ کیوں قلب بے سودا نہیں؟

یہ ضیاباری نہیں ہے گر جبینِ یار کی
دل کو کیوں بیتاب رکھتی ہے خلش دیدار کی

اس منظّم میکدے کا اک ایس ساقی بھی ہے
اور اُس کی چشمِ میگوں میں مئے باقی بھی ہے

۳ر فروری ۱۹۳۷ء

غزل

آرزوئے دوام نے مارا! | جلوۂ صبح و شام نے مارا!
سرکشی گام گام پر مجھ سے | اس دلِ بد لگام نے مارا!
ابتدا کی نہ انتہا کی خبر | قصّہ ناتمام نے مارا!
عقل خود ہی شکارِ جذبہ ہوئی | غزنوی کو غلام نے مارا!
حرص نے کچھ بھی دیکھنے نہ دیا | دانۂ زیرِ دام نے مارا!
سچ تو یہ ہے کہ ابنِ آدم کو | جذبۂ انتقام نے مارا!

میں ایسؔ کب فریب کھاتا تھا
دہر کے اہتمام نے مارا!

۹ اپریل ۱۹۳۴ء

"رہے نام اللہ کا"

(اپنے عزیز ترین دوست خانصاحب چوہدری محمد اکبر خان مرحوم کی یاد میں)

زندگی زیرِ فلک بازیٔ طفلانہ نہیں
کارخانہ ہے جہاں کوئی طرب خانہ نہیں

آرزو ہے کہیں حسرت ہے، زیاں کاری ہے
ہر قدم موت کی دہشت سے منوں بھاری ہے

شدّتِ غم میں ٹپک پڑتے ہیں آنسو خود ہی
یوں نکل آتا ہے تسکین کا پہلو خود ہی

۲

ٹل نہیں سکتی ہے ٹالے سے گھڑی جانیکی
اپنے اعمالِ بد و نیک کا پھل پانے کی

ہاتھ خالی ہی بھرے گھر سے نکل پڑتے ہیں
عدم آباد کو تنہا سبھی چل پڑتے ہیں

کوئی تحفہ شہِ شاہاں کے لئے ساتھ نہیں
ہاتھ میں کاسۂ دریوزہ گری ہاتھ نہیں

۳

رحمتِ خاص سے یہ کاسۂ خالی بھر دے!
بینوا پر نظرِ عفوِ "قدیمی" کر دے!

تیری رحمت کے سہارے ہی گنہگار جیا
اب بھی تیرے ہی کرم پر وہ کٹے ہے تکیہ!

اپنی رحمت سے اسے راندۂ درگاہ نہ کر!
بینوا بندے کو محرومِ کرم آہ نہ کر!

۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء

شباب

"سفلی"

بتوں کے کوچے کی خاک چھانے شباب ایسا وبالِ جاں ہے
جو تیرِ مژگاں سے جاں بلب ہو جواں وہ کس کام کا جواں ہے
کمندِ رستم سے بڑھ کے ہو جس اسیر کا کل کو زلفِ شبگوں
فلک کی اک ضرب سہہ سکے اس غریب میں یہ سکت کہاں ہے؛
جو وقفِ آغوشِ عیش و عشرت ہوئی جوانی، گئی اکارت
نصیب اعدا شباب ایسا جو جبہ سائے درِ بتاں ہے
جو تختۂ مشقِ تیغِ ابرو ہوئی وہ بے کار ہے جوانی
متاعِ دل جو لٹا چکا ہو شباب وہ ننگِ کارواں ہے

علوی

نگہ میں لائے نہ دو جہاں کو شبابِ آزادہ خو کہاں ہے؟
کدھر وہ مستِ عمل جوانی کہ گردِ رہ جس کی کہکشاں ہے؟
جو ماہ و خورشید بن کے چمکے ہے چشمۂ فیض وہ جوانی
ہو دردِ سارے جہاں کا جس میں شباب وہ فخرِ انس و جاں ہے
خودی کے اثباتِ روح پرور کو بت بنا کر جو پوجتا ہو
حریمِ ہستیٔ قوم کا وہ جواں محافظ ہے پاسباں ہے
جو تیغِ اخلاص و بے ریائی کو روز و شب بے نیام رکھے
امینِ خضر ہے شباب وہ پیشوا ہے سالارِ کارواں ہے

۲۳ مئی ۱۹۳۴ء

غزل

میں یہ کب کہتا ہوں کمبخت انہیں یاد نہ کر
شیون و آہ مگر اے دلِ ناشاد نہ کر

درد سینے میں نہاں رہ کے اثر رکھتا ہے
ہمنشیں تک سے بیاں حسن کی بیداد نہ کر

اپنی آنکھوں کو نہ خونابہ فشاں ہونے دے
مفت میں لعلِ خداداد کو برباد نہ کر

پھونک دے نغمۂ جانسوز سے سامانِ قفس
بلبلِ تفتہ جگر شکوۂ صیّاد نہ کر

لطف جینے کا ہے جب ہی کہ "دلِ مست خودی"
آسماں تک سے یہ کہہ دے "مری امداد نہ کر"

عقل و جذبات کو رکھ تابعِ فرماں اپنے
اُس کو سر پہ نہ چڑھا اور انہیں آزاد نہ کر

یاس میں پھوڑتے ہیں سر ترے ہیں کم ظرف امینؔ
ظرف عالی ہے ترا بیعتِ فرہاد نہ کر

۷ رجون ۱۹۳۴ء

جہانِ خویش

خلّاقِ جہانِ خویش ہوں میں
فرماں دہِ جانِ خویش ہوں میں
اخلاص کے صیقلِ دروں سے
آئینۂ شانِ خویش ہوں میں

۲

جس دل کا الگ جہاں نہیں ہے
فانی ہے وہ جاوداں نہیں ہے
ہے خانہ بدوش، جس کا اپنا
رہنے کو کوئی مکاں نہیں ہے

۳

اوروں کا جہان اک قفس ہے
یہ قولِ نگاہِ نکتہ رس ہے
بلبل کو ہے بوستاں کا پٹّہ
ٹہنی پہ جو اس کی مشتِ خس ہے

۴

مٹی کی نہیں یہ میری دنیا
ہے عرش بریں یہ میری دنیا
کس شانِ خودی سے گا رہا ہوں!
میری ہے ایں یہ میری دنیا

۳۰ رجون ۱۹۳۴ء

ستارۂ صبح

نقیبِ مہر ہے تو یا کوئی ستارہ ہے
رقیبِ ماہ تو ہے یا کہ ماہ پارہ ہے؟

چمک اٹھی ہے جبینِ فلک تری ضو سے
ستارے سربگریباں ہیں تیرے پرتو سے

وہ جامِ ظلمتِ شب کو پلا دیا تو نے
کہ دن کی گود میں اس کو سلا دیا تو نے

مثالِ برق گریزاں جو اس قدر تو ہے
ضمیرِ مہر کا کیا مطلعِ نظر تو ہے؟

ہے لب پہ فجر کے جو کیا وہ شعرِ تر ہے تو ہی
ستارہ صبح کا یا نغمۂ سحر ہے تو ہی؟

سرور بار ہے پرکیف ہے ضیا تیری
نمو اس لئے ہی مختصر ہے کیا تیری؟

ترا جمال صبوحی ہے اہلِ دل کے لئے!
کمندِ عرشِ بریں تو ہے "آب و گِل" کے لئے!

۲۵ جولائی ۱۹۳۴ء

واردات

خود چھپ رہے ہیں دل کو ذوقِ نگاہ دیکر
پیمانِ درد لے کر فرمانِ آہ دے کر

ہے جستجو اسی کی ہے آرزو اسی کی
دل لے گیا ہے میرا جو اپنی چاہ دے کر

ہستی کو زیر کرنے بھیجا گیا عدم سے
ارمان دآرزو کی دل کو سپاہ دے کر

عقل و شعور دونوں ثابت ہوئے ہیں رہزن
بھیجا گیا تھا مجھ کو یہ خضرِ راہ دے کر

لطف و کرم سے ان کے سر پھر نہ جائے تیرا
وہ آزما رہے ہیں زرّیں کلاہ دے کر

۱۴ر اگست ۱۹۳۴ء

غزل

تمنّا مدعا ارمان دِل کے — ازل سے ہیں یہی سامان دل کے
الٰہی اس دلِ بے چین کی خیر! — جو قابو میں ہے اک انجان دل کے
جفا سہنا مگر اُف تک نہ کرنا — جگر کے میں فدا قربان دل کے
نہیں آتے نہ آئیں وہ مرے گھر — تصور میں تو ہیں مہمان دل کے
کسی کا ہوں کسی کا میں ابد تک — یہ ہیں وعدے یہ ہیں پیمان دل کے
نبردِ زندگی مشکل نہیں ہے — خطا لیکن نہ ہوں اوسان دل کے

اگر ہے زندگی کے راگ کا شوق
ابھی کھولے رہو تم کان دِل کے

۲۰ راگست ۱۹۳۴ء

غزل

دو جہاں مل گئے جس کو دلِ غم خوار ملا
دعوتِ عشق ملی۔ وعدۂ دیدار ملا

چشمِ مخمور کا بوسہ نہیں ساقی سے مجھے
اک چھلکتا ہوا جامِ مئے گلنار ملا

نہ سہی وصل کے اب ہجر کے لوٹینگے مزے
تجھ کو کیا اے فلک بے سبب آزار ملا؟

جوہرِ حسن نہیں عشق کے جوہر سے الگ
چشمِ بیمار انہیں مجھ کو دلِ زار ملا

دل نہیں ساقیٔ میخانۂ ہستی سے مجھے
جس کو کہتے ہیں "خمِ بادۂ افکار" ملا

اپنے بیگانے ہیں مطلب کے سبھی دیکھ لیا
بے ریا ایک بھی ہمدرد نہ غمخوار ملا

مدّعی چرب زبانی میں ہے استاد درست
دل امیں اس کو مگر منکرِ کردار ملا

۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

آرزو

زندگی کا سمندِ ناز ہے تو
بادۂ تُندِ خانہ ساز ہے تو

مہرِ دنیائے ذی شعور ہے تو
بادۂ زیست کا سرور ہے تو

زندگی گل اگر ہے بو تو ہے
شجرِ زیست کی نمو تو ہے

موجِ برقِ رگِ عمل تو ہے
عقدۂ زندگی کا حل تو ہے

شہپرِ بازِ ارتقا تو ہے
اصل میں رازِ ارتقا تو ہے

شانۂ کاکلِ حیات ہے تو
یعنی خلّاقِ ممکنات ہے تو

جس میں تیری مئے طہور نہیں
دل وہ خمخانۂ شعور نہیں

اس میں جذبات کا وفور کہاں؟
اس میں "طورِ خودی" کا نور کہاں؟

تیرے فقدان میں خرابی ہے
تو ہی دل کی گھڑی کی چابی ہے

رونقِ بزمِ زندگی تجھ سے
گرمیٔ رزمِ زندگی تجھ سے

آرزو! اے زرِ گلِ ہستی!
سربسر نشۂ ملِ ہستی

تو نہ ہوتی تو زندگی کیا تھی؟
ایک بے لطف سا تماشہ تھی

۲۱ ستمبر ۱۹۳۴ء

زندگی کا مقامِ محمود

حیات کہتے ہیں جس کو ناداں! دل و جگر کا یہ امتحاں ہے
یہی وہ شمشیرِ فطرۃ اللہ ہے جس کا سنگِ فساں جہاں ہے
مصیبتوں ہی میں پھنس کے نیرے کھلینگے جو ہیں نہفتہ جوہر
دعائیں دے آسماں کو دشمن ترا اگر دورِ آسماں ہے
متاعِ صبر و قرار پہ دل ہی اصل میں ڈالتا ہے ڈاکے
اگر ذرا احتیاط برتیں تو یہ لٹیرا ہی پاسباں ہے
عمل کے شعلے سے کوئی نسبت نہیں ہے تقریر کے دھوئیں کو
بس پوچھتا ہوں کہ ہاتھ بھی ہیں، یہ میں نے مانا تری زباں ہے
حیات زیرِ فلک ہماری نہیں ہے بچوں کا کھیل ہمدم!
ہے کارخانے میں قدر اسی کی جو کارکن ہے جو کارداں ہے

غرور کہتا ہے جو خودی کو نفور اس سے خودی رہے گی
ہے ننگِ ہستی اسی کی ہستی جو اپنی ہستی سے بد گماں ہے
خودی کو کہتے ہیں دل کے جذباتِ بہتریں کی ایک نمائش
غرور کا اس "مقامِ محمود" زندگی میں گذر کہاں ہے؟

۲۷ جنوری ۱۹۳۵ء

غزل

آنکھوں میں چھلکتے ہیں ہمرنگِ حنا آنسو
مہجور کے آنسو بھی ہوتے ہیں بلا آنسو

بیساختہ رونے سے تسکین سی ہوتی ہے
دردِ دلِ محزوں کی ہیں کچھ تو دوا آنسو

اک خستہ جگر عاشق رو رو کے یہ کہتا تھا
آسان ہے ہر مشکل گر دیں نہ دغا آنسو

سر خاک پہ دھر دھر کر دیتے ہیں دعا دل سے
ہیں عاشقِ صادق کے پابندِ وفا آنسو

اکسیر مجرب ہیں کر ضبط انہیں یعنی
دل ہی کا یہ جوہر ہیں دل ہی کو پلا آنسو

مجبور ہوں بہنے پر بیساختہ گر جائیں
قانونِ محبّت میں ہیں حسبِ ہوا آنسو

ناسورِ محبت کا ہوتا نہ امیںؔ چرچا
غمّاضؔ نہ بن جاتے گر "لعل نما" آنسو

۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء

غزل

چشمِ مخمور کا ہوں دیوانہ ہے یہ میخانہ میرا پیمانہ
جن نگاہوں میں ہی جہانِ سرور ہیچ ہے ان کے آگے میخانہ
جو حقیقت بیں اک حقیقت ہے عشق ہی کا ہے اک وہ افسانہ
دل ہو دیوانہ کیوں نہ آپ اپنا؛ شمع ہے خود ہی خود ہی پروانہ
قدر کر اپنے "جامِ پہلو" کی دورِ حاضر کا ہے یہ پیمانہ
ہے نہاں گنجِ شائیگاں جس میں دل کا ویرانہ ہے وہ ویرانہ

حاتموں سے ہوں بے نیاز امیں
ہے مزاجِ فقیر شاہانہ

۴ مارچ ۱۹۳۵ء

ترانۂ مرغِ اسیر

نہ عیشِ صحبتِ گلہائے نو اڑانے دے
چمن تک اڑ کے نہ صیّاد مجھکو جانے دے
مرے تصوّرِ رنگیں کی خیر مانگ ابھی
قفس ہی باغ بنے گا بہار آنے دے

۲

بہار برقِ رگِ جانِ ناتواں ہوگی
بشکلِ نغمۂ جانسوز بر زباں ہوگی
خیال مجھ کو نہ ہوگا کچھ آب و دانے کا
فراقِ گل میں مری زندگی فغاں ہوگی

۳

صبا کے دوش پہ جائیگی داستاں میری
سنے گی باغ کی اک اک کلی فغاں میری
نہیں ہے غنچہ کوئی طول و عرضِ گلشن میں
جو بطنِ شاخ میں سیکھا نہ ہو زباں میری

۴

وفورِ شوق میں شیون کی انتہا ہوگی
رسا بہار ہی میں آہِ نارسا ہوگی
چمن میں شور نہ میگا نہ ہمصفیروں کا
حضورِ گل میں قیامت سی اک بپا ہوگی

۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء

جوہرِ قابل

ترنّم ریز ہر تارِ نفس ہے ذوقِ نغمہ سے
مرا وجدان ہے مضراب میرے بربطِ دل کی

مرے ہی ظرف کا ممنون ہے ہستی کا میخانہ
مرے ہی سوز کی قندیل سے رونق ہے محفل کی

ہے طوفاں دربغل جس موجِ مضطر کا اک اک قطرہ
اسے کیوں جستجو ہو راحتِ آغوشِ ساحل کی

مجھے اتنی خبر ہے میں جہاں بھی ہوں مسافر ہوں
فسوں ہو، سحر ہو، کچھ ہو کشش نیرنگِ منزل کی

اُسی جوہر کا یہ فیضان ہے کہتے ہیں دل جس کو
ایں معلوم ہے دنیا میں جو توقیر ہے گِل کی!

۱۲ مئی ۱۹۳۵ء

غزل

شوقِ بیتاب ہے سینے میں یہ پردا کب تک؟
ذوقِ انگشت بدنداں ہے، یہ چرچا کب تک؟

تجھکو تیری ہی قسم اے حرمِ نازکے راز!
تجھ کو ہونا ہے پرستار پہ افشا کب تک؟

حسن کے مہرِ جہاں تاب ترے نور کی خیر!
یونہی تاریک رہیگی مری دنیا کب تک؟

کیف پرورنگہِ لطف و کرم اے ساقی!
مے سے محروم رہیگی مری مینا کب تک؟

تو ہی کہہ سکتا ہے اے دل کے چمن کے مالی!
باروَر ہوگا مرا نخلِ تمنا کب تک؟

امتحاں کیا مرے سودا کا ہے منظور کہیں؟
مجھ سے پردے میں رہیگی مری لیلےٰ کب تک؟

اے امینؔ دل نہیں دانہ ہے تہِ دامِ حیات
رونما دیکھئے ہوتا ہے وہ عنقا کب تک؟

۱۸ رمئی ۱۹۳۵ء

غزل

یارب غرور توڑ کسی مستِ ناز کا
مطلب ہے مختصر گلہ ہائے دراز کا

جب دیکھو غمزۂ بد کی نمائش پہ زور ہے
گویا یہی صلہ ہے ہمارے نیاز کا

جس سے ہے بزمِ عیش منوّر حضور کی
ہے وہ چراغ میرے ہی سوز و گداز کا

پھر کیا تھی گریہ دل شکنی کی سزا نہ تھی؟
غازیٔ سومنات برہمن ایاز کا!

خود پردہ ہے وجودِ پسِ پردہ کی دلیل
اور آئینہ سراغ ہے آئینہ ساز کا

نکلے جنابِ شیخ بھی پھر تو ہوا پرست
گر وصلِ حور اجر ہے ان کی نماز کا

ہو غرقِ فکرِ بندگیٔ غیر صبح و شام
شیوہ نہیں امیںؔ یہ دلِ بے نیاز کا

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء

غزل

دلیلِ رہ "چراغِ خودی" اگر ہو جائے
قدم مسافرِ ہستی کا تیز تر ہو جائے

مقامِ عالیِٔ عرفانِ ذات ہے یعنی
خودی یہی ہے کہ تجھکو تری خبر ہو جائے

تری نگاہ کو رفعت کا خوف ہے ورنہ
نہیں محال کہ تو زیر سے زبر ہو جائے

وہ دل سپہر کھٹکتا ہو آنکھ میں جس کی
مثالِ مہر ادھر تیغ اُدھر سپر ہو جائے

خسِ خدا زدہ برباد کیوں ہے گلشن میں؟
کہو اُسے کہ جلے اور شرر شرر ہو جائے

ہے قطرہ قطرہ ترے خونِ گرم کا خودِ لعل
بشرطِ آنکہ بدخشاں ترا جگر ہو جائے

مقیمِ خمکدۂ دہر ہے امیںؔ ساقی!
ادہر بھی لطف و عنایت کی اک نظر ہو جائے

۹ جون ۱۹۳۵ء

لا الٰہ الا اللہ

حریمِ نازِ خداوندِ ناز کی سوگند! — نگاہِ پاک دلِ پاکباز کی سوگند!
قسم ہے حُسن کے اندازِ بے نیازی کی! — جبینِ عشقِ سراپا نیاز کی سوگند!
قسم ہے غزنویِ بت شکن کے بازو کی! — کمندِ زلفِ درازِ ایاز کی سوگند!
قسم ہے مہر و مہ و انجمِ درخشاں کی! — کرشمۂ فلکِ شعبدہ باز کی سوگند!
قسم ہے عکسِ رخِ مہر و ماہ طلعت کی! — کمالِ صنعتِ آئینہ ساز کی سوگند!
قسم ہے مطربِ ہستی کے ذوقِ نغمہ کی! — اور اس کے دردبھرے تارِ ساز کی سوگند!

ملی ہے جس کو مئے لا الٰہ الا اللہ
وہ رندِ میکدہ مغضوب ہو نہیں سکتا

۱۲؍ جون ۱۹۳۵ء

مرقّع

صوفی

ہستی کو حجاب کہہ رہا ہے
موجود کو خواب کہہ رہا ہے
صوفی کو نگاہ دے الٰہی!
قلزم کو سراب کہہ رہا ہے

۲

عکس آپ سے آپ کہہ رہا ہے
یہ دیکھ وجودِ آئنہ ہے
شاہد یہ مرا ہیں اس کا شاہد
ذات اس کی جدا مری جدا ہے

فلسفی

۳

شیشے کو شراب کہہ رہا ہے
نغمے کو رباب کہہ رہا ہے
کیا کہنے نگاہِ فلسفی کے!
جوہر کو حباب کہہ رہا ہے

شیخ

۴

تلچھٹ کو شراب کہہ رہا ہے　　پیری کو شباب کہہ رہا ہے
سب شیخ کی خود فریبیاں ہیں　　منہ پر ہی خضاب کہہ رہا ہے

واعظ

۵

حوروں کے حضور عاشقِ زار　　جنّت کے جناب رندِ مے خوار
واعظ کو نہ سادہ لوح سمجھیں　　"دیوانہ بکارِ خویش ہشیار"

۹ ستمبر ۱۹۳۵ء

غزل

پسندِ خاطرِ جاناں ہے انکسار مرا
اسی لئے تو مہ و مہر ہیں غبار مرا

ملی ہے مجھ کو ازل سے کمندِ یزداں گیر
شکار ہر کس و ناکس نہیں شکار مرا

علی الصباح مجھے بھر کے جامِ نجمِ سحر
مدام دیتا ہے ساقیٔ نامدار مرا

مثالِ لالہ محبت کے داغ ہوتے ہوئے
نہیں ہے دامنِ دل دیکھ داغدار مرا

مزا ہے وصل میں اور لطف ہجرِ یار میں ہے
وہ پھل کا وقت یہ ہے موسمِ بہار مرا

نوائے نور ہو جب میرے لب پہ اہلِ چمن!
تو احترام کرے کیوں نہ شاخسار مرا

پرکھ سکے جو مجھے وہ نگاہِ پاک کہاں!
جدا ابھی ہے زر و سیم سے عیار مرا

۵ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

نکات

۱

وہ رزمِ ہستی میں کیا لڑیگا مدام تر جس کی آستیں ہے
وہ بزمِ ساقی میں بے حقیقت ہے جس کا بے بادہ ساتگیں ہے
وہ جن میں نورِ شعور و وجداں نہیں ہے مٹی کی مورتیں ہیں
نگاہِ فطرت میں دل نہیں ہے وہ دل کہ جسمیں یقیں نہیں ہے

۲

سجود کی جس جبیں میں پیہم تڑپ نہیں وہ جبیں نہیں ہے
عمل سے بیزار ہو جو بازو وہ اصل میں مارِ آستیں ہے
نگہ وہ کیا جو تڑپ کے رہ جائے دامِ دنیائے رنگ و بُو میں
نگہ وہی ہے جو پردہ در ہے جو نکتہ رس ہے جو دُور بیں ہے

۳

نہیں تمنّا سے کام جس کو وہ دل کسی کام کا نہیں ہے
جس آستیں میں نہیں ہے بازو نری دکھاوے کی آستیں ہے

کھدا ہوا ہے ازل سے جس دل پہ آرزوؤں کا اسمِ اعظم
وہ اصل میں خاتمِ سلیمانِ ارتقا کا امیں نگیں ہے

۲۳ر نومبر ۱۹۳۵ء

رجزِ آرزو

نگاہِ پردہ در کی آرزو کر ! دلِ بالغ نظر کی آرزو کر
نگہ گنج آفریں ہے ۔ کیمیا ہے نہ گوہر کی نہ زر کی آرزو کر

۲

ارے دیوانے! ثمر کی آرزو کر دلِ شبنم! گہر کی آرزو کر
رہینِ آشیاں شاہیں بچے کیوں فضا و بال و پر کی آرزو کر

۳

شبِ تیرہ! سحر کی آرزو کر تو اے اندھے! نظر کی آرزو کر
نگاہِ مہرِ عالمتاب ہے شرط یونہی مت سجدہ بر کی آرزو کر

۴

مسافر ہے سفر کی آرزو کر تو راہِ پُرخطر کی آرزو کر
یہی شمشیرِ رزمِ زندگی ہے امیں! دل کی جگر کی آرزو کر

۲۴ نومبر ۱۹۳۵ء

نگاہِ اوّلیں

الہام نگاہِ اوّلیں تھی	یا حور و ملک کی آفریں تھی!
ہوں محوِ سجودِ عجز جب سے	گویا وہ نگہ نہیں جبیں تھی

۲

وہ پہلی نگہ نگہ نہیں تھی	خلّاقِ نگاہِ نوریں تھی
تھی عشق کی بندگی کا اظہار	بے چونیِ حُسن کا یقیں تھی

۳

دل کی نہ جگر کی آفریں تھی	کیا چیز نگاہِ اولیں تھی!
اب جا کے ایں ہوا ہے معلوم	وجدان کے عرش کی مکیں تھی

۲۲ دسمبر ۱۹۳۵ء

غزل

عشق میں بے آبرو ہونا پڑا
دو ہی دن میں تم سے تو ہونا پڑا

تھی یہ کس کی آرزو جس کے لئے
تارکِ صد آرزو ہونا پڑا

لالہ زارِ سینہ! ہاں تیرے لئے
آنکھ ہی کو آب جو ہونا پڑا

کن بلا نوشوں کا بزم دہر میں
شیشہ و جام و سبو ہونا پڑا

نا بچے لوں کام صبر و ضبط سے
آسماں سے دُو بدو ہونا پڑا

عشق کا انجامِ رنگیں دیکھئے
اشکِ سادہ کو لہو ہونا پڑا

عندلیبِ باغِ ہستی کو ایں
مُبتلائے رنگ و بو ہونا پڑا

۲۹ دسمبر ۱۹۳۵ء

التجا

خدائے پاک خاک کو نگاہِ پاکباز دے
مرے گلی چراغ کو فروغِ جاں نواز دے!

ازل سے تا ابد تری "ایازیاں" ہیں جلوہ گر
"خودی" کے غزنوی کو بھی نیاز کیش ناز دے!

خموش بزمِ دہر میں رہے نہ بربطِ حیات
مرے نفس کے تار تار کو نوائے ساز دے!

چہک ہو عندلیب کی لبانِ گل مہک اٹھے
اسیرِ باغِ دہر کو وہ سوز دے یہ ساز دے!

طلسمِ رنگ و بو میں ہیں چھپی ہوئی حقیقتیں
شہیدِ جستجو بنا نگاہِ امتیاز دے!

حریمِ ہست و بود شمعِ دل سے جگمگا اٹھے
خدائے طور ہاں اسے وہ سوزِ دل گداز دے!

ازل سے پیرِ میکدہ ہے تجھ سے میری التجا
مریدِ خاص ہے ترا امیں کو خانہ ساز دے!

۱۰ ر فروری ۱۹۳۶ء

صد آفریں

اے دلِ ایذا طلب صد آفریں! | اے سرِ سودا طلب صد آفریں!
اے نگاہِ جلوہ جو صد مرحبا! | دیدۂ سینا طلب صد آفریں!
پنجۂ فولاد خواہ صد مرحبا! | بازوئے خارا طلب صد آفریں!
مرحبا غوّاصِ بحرِ بیکراں! | رہروِ صحرا طلب صد آفریں!
دانۂ خرمن بہ پہلو مرحبا! | قطرۂ دریا طلب صد آفریں!
اے پرِ پرواز جو صد مرحبا | طائرِ طوبیٰ طلب صد آفریں!

اے حقائقِ جو ایتن صد مرحبا!
بندۂ مولا طلب صد آفریں!

۹ رفروری ۱۹۳۶ء

زکات

۱

کاوشیں ہی کاوشیں ہیں عمر بھر دل کے لئے
اصل میں اک برقِ مضطر ہے نفسِ گل کے لئے
زندگی کا قلزمِ ذخّار ہے طوفاں سرشت
اضطرابِ موج ہے آغوشِ ساحل کے لئے

۲

قلزمِ مواجِ ہستی کا سکوں ممکن نہیں
موج کے چھٹ جائیں اندازِ جنوں ممکن نہیں
ہے گلِ حسّاس میں جب تک شرارِ زندگی
چین لینے دے اسے سوزِ دروں ممکن نہیں

۳

زندگی کو ہے تمنّائے بقا آغاز سے
اس کی جولاں گاہ ہیں ارض و سما آغاز سے
زندگی وہ تیغ جوہر دارِ فطرت ہے ایسی
جس کا ہے سنگِ فساں ہی "ماسوا" آغاز سے

۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء

زکات

نیک ہونے سے رہی خوئے بدِ چرخِ کبود
ضبط کر ضبط کہ ہے ضبط ہی تمہیدِ کشود

رند وہ معتکفِ کعبہ سے بہتر ہے ابھی
دیر میں رہ کے بتوں کو نہ کئے جس نے سجود

۲

بزم ہر رنگ ہے صاحبِ نظر اس بزمِ شہود
کھول کر دیدۂ دل دیکھئے نیرنگِ نمود

دخل ماحول کا بھی ہے کسی حد تک لیکن
جوہرِ ذات ہے اکثر اثر اندازِ وجود

۳

تیرے قربان نگاہِ دلِ بیتابِ سجود
تو ہی حق بیں ہے کہ بے صد نہیں بزمِ شہود

مہر ذرّوں کا ہے اور مہر کے ذرّے شاہد
چھڑ گیا مفت میں کیوں مسئلۂ بود و نمود

۱۵ مئی ۱۹۳۶ء

غزل

آخرِ کارِ محبت کا اثر ہو کے رہا
اشک جو تھا صدفِ دل میں گہر ہو کے رہا

دردِ دل اصل میں تھا ولولۂ جوشِ نمو
جس سے یہ دانۂ ناچیز شجر ہو کے رہا

عشق میں جوشِ عبودیتِ دل دب نہ سکا
کہیں آنسو کہیں نالہ کہیں پر ہو کے رہا

آرزو بر وہی آئی جو رہی دل کی رفیق
شاخ کی گود کا غنچہ ہی ثمر ہو کے رہا

ذرہ ذرہ مجھے آتا ہے نظر طورِ کلیم
شوقِ دیدار دل افروزِ نظر ہو کے رہا

میں نہ کہتا تھا کہ لے دیدۂ تر ضبط سے کام
خونِ دل ہو کے رہا خونِ جگر ہو کے رہا

بزمِ ہستی میں رہا زمزمۂ زیست بلب
رزمِ ہستی میں ایس سینہ سپر ہو کے رہا

۳۰ رمئی ۱۹۳۶ء

معارف

یہ جہانِ رنگ و بو خمخانہ ہے — حسن کی مے عشق کا پیمانہ ہے
امتحانِ ظرف لیتے ہیں یہاں — بزمِ دنیا محفلِ رندانہ ہے

۲

عالمِ ایجاد خلوت خانہ ہے — سر بسر انداز معشوقانہ ہے
دیدۂ مشتاق ہے سرگرمِ دید — اور ہر سو جلوۂ جانانہ ہے

۳

جس سے تو اے بیخبر بیگانہ ہے — وقت کی مے کا وہی پیمانہ ہے
قدر کر دل کی خدا را قدر کر — تو شریکِ محفلِ رندانہ ہے

۴

جس کا پہلو درد سے بیگانہ ہے — وہ ایک اجڑا ہوا مے خانہ ہے
جس کے سینے میں نہیں جوشِ نمو — ننگِ گلشن کرمِ خوردہ دانہ ہے

۷؍جون ۱۹۳۶ء

غزل

جنوں کے فیض سے حاصل ہے یہ کمال مجھے
نہ آستیں کا نہ دامن کا ہے خیال مجھے

بنا ہو جب کہ مرا سینہ آئینہ خانہ
شکستِ شیشۂ دل کا ہو کیوں ملال مجھے

مری بلا سے کوئی لاکھ حاتم طے ہو
کہ ابتدا سے نہیں عادتِ سوال مجھے

یہ بدلگام سہی میں بھی کم سوار نہیں
زمانہ کر نہیں سکتا ہے پائمال مجھے

کمالِ عشق کہوں کیوں نہ اس تصور کو
کہ جس کے فیض سے ہو ہجر بھی وصال مجھے

میں صاف گو ہوں کہ دل میں نہیں ہے میل کوئی
میں راست رو ہوں کہ بھاتی نہیں ہے چال مجھے

ادب نواز کہا کرتے ہیں اہلِ حزیں
مگر عوام محمد مسیح پال مجھے

۱۱ر جولائی ۱۹۳۶ء

غزل

تفکرات کی دنیا میں جستجوئے سکوں
علاج جس کا نہیں کوئی ہے یہی وہ جنوں

تڑپ ہی جب ہے وجود و نمودِ برقِ حیات
محال ہے کہ جیوں اور بیقرار نہ ہوں

اسی کے خون سے رنگیں ہے داستانِ حیات
تمہیں کہو کہ کروں کیا جو آرزو نہ کروں

ہو شکوہ سنج ہی کیوں دل کو جب ہو یہ معلوم
بنے ہیں کس کے لئے رنجہائے گونا گوں

شراب خانہ میں مینا شراب سے خالی!
ہو دل بھی اور تمنّا سے بے نیاز رہوں!

خدنگِ ناز پہ اس شوخ نے ہے لکھ رکھا
نہیں ہے فخر کے قابل شکارِ صیدِ زبوں

امیںؔ جو وقف ہو بہبودِ خلق ہی کے لئے
خوشا وہ دردِ نہاں! اور زہے وہ سوزِ دروں!

۲۱ راگست ۱۹۳۶ء

غزل

بیتابیٔ نگاہ سے اہلِ نظر ہوئے
مانندِ شمع سوز سے ہم خود نگر ہوئے

پرواز کی خلش کو نشیمن نہیں عزیز
دانے جنہیں نمو کا جنوں تھا شجر ہوئے

جو نونہال طالبِ بالیدگی رہے
پھولے وہی چمن میں وہی بارور ہوئے

کھولی صدف نے جنکے لئے تربیت کی گود
ابرِ بہار کے وہی قطرے گہر ہوئے

جو غنچے شاخ سے رہے پیوستہ اے امیںؔ!
اک دن گُلِ شگفتہ ہوئے اور ثمر ہوئے

۵ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

غزل

بادۂ ناب سے پُر اس لیے پیمانہ نہیں
دستِ بازو میں ترے جرأتِ رندانہ نہیں

دل حقیقت میں وہی اہلِ نظر دل ہے کہ جو
اپنے ماحول کے جذبات سے بیگانہ نہیں

عقل کو جس نے ہوس ہی کیلئے وقف کیا
وہ خرد باختہ دیوانۂ فرزانہ نہیں

دیکھکر شمعِ فروزاں کو رہے مستِ حیات
بوالہوس وہ مگسِ خوار ہے پروانہ نہیں

واعظِ شہر جو رندوں کو بُرا کہتے ہیں
آپ کی اپنی روش بھی تو بزرگانہ نہیں

نوجوانوں کو ابھی دیکھ کے جی جلتا ہے
صورتیں کچھ بھی ہیں سیرتیں مردانہ نہیں

۱۵ / اکتوبر ۱۹۳۶ء

نگاہ پاک

حریمِ حسنِ فطرت میں نہیں جس سے کوئی پردا
بنی ہے جس کی مشقِ ناز کو اسرار کی دنیا
کہیں جسکو کلیدِ قفلِ این و آں تو ہے زیبا — اُسی میمن و سعادت کو نگاہِ پاک کہتے ہیں

۲

تقاضائے دلِ ناہید ہے جس کی ہم آغوشی
تمنائے مہ و خورشید ہے جس کی ہم آغوشی
فلک کیا عرش تک کو عید ہے جسکی ہم آغوشی — اُسی میمن و سعادت کو نگاہِ پاک کہتے ہیں

۳

پڑے بلبل پہ جو اور اس کو موسیقار کر ڈالے
جو الجھے خار سے اور خار کو گلزار کر ڈالے
جو ذرّوں کو تڑپ کر صاحبِ کہسار کر ڈالے — اُسی میمن و سعادت کو نگاہِ پاک کہتے ہیں

۴

جو بزمِ زندگی میں بادۂ سرجوش ہے یکسر
جو رزمِ زندگی میں بطلِ آہن پوش ہے یکسر
جو دنیائے عمل میں دستِ پیہم کوش ہے یکسر
اُسی مومن سعادت کو نگاہِ پاک کہتے ہیں

۵

رگِ پاکِ محبت جس مئے باقی کا مینا ہے
دلِ اخلاص پرور جس چراغِ حق کا سینا ہے
حریفِ سرمۂ تسخیر جس سے چشم بینا ہے
اُسی مومن سعادت کو نگاہِ پاک کہتے ہیں

۶

کتابِ زندگی میں "سوختن" کا باب پیدا کر
ربابِ زندگی کی نغمہ زا مضراب پیدا کر
سرابِ زندگی میں آ امیں! گرداب پیدا کر
کہ مشتِ خاک کو جب ہی نگاہِ پاک ملتی ہے

۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء

پسند اپنی

مری دنیا خیال کی دنیا
تیری مال و منال کی دنیا

عیش حاضر ہے تیری دنیا میں
میری دنیا مآل کی دنیا

میری دنیا میں پرسش سیرت
اور تری خد و خال کی دنیا

تیری دنیا نگاہ کی مستی
میری دنیا جمال کی دنیا

تیری دنیا میں قیل و قال پہ زور
اور مری وجد و حال کی دنیا

تیری دنیا میں بولہب کا فروغ
میری دنیا بلالؓ کی دنیا

میری دنیا امین ہے صبح ازل
تیری مہر و ہلال کی دنیا

۴ر نومبر ۱۹۳۶ء

مصطلحاتِ امیں

عقل کو مادرِ آفات کہا کرتا ہوں
دشمنِ ارض و سموات کہا کرتا ہوں

فلسفہ ہرزہ سرائیِ تخیل ہے جبھی
اس کو طومارِ خرافات کہا کرتا ہوں

زیست کو سلسلۂ عیش سمجھتے ہیں جناب
میں تو زنجیرِ مکافات کہا کرتا ہوں

زندگی مصرعِ تر آپ کے نزدیک سہی
میں اسے "خمسۂ ہیہات" کہا کرتا ہوں

آئینہ صورتِ "فردا" کا ہے "امروز" مجھے
"دوش" کو منظرِ مافات کہا کرتا ہوں

حسنِ فطرت کا تماشہ ہیں مرے صوم و صلوٰت
دل کی حیرت کو مناجات کہا کرتا ہوں

حسن ساقیِ ازل ہے مرے نزدیک امیںؔ
عشق کو رندِ خرابات کہا کرتا ہوں

۱۶ نومبر ۱۹۳۶ء

غزل

بے مدعا نہیں ہے میری یہ پاکبازی[۱] — دل کو سکھا رہا ہوں آئینِ بے نیازی

اے محوِ دیدِ منظر دھوکے سے بچ کے رہنا — طوفانِ رنگ و بُو ہے فطرت کی کارسازی

پتھر کی مورتوں کا آساں ہے توڑ دینا — اے غزنوی نہ ٹوٹا تجھ سے بُتِ ایازی

سوزِ درونِ دل کا ہے اک لطیفہ پردہ — میری یہ بزلہ سنجی میری یہ نے نوازی

کافر گری کے شائق میں اتنا جانتا ہوں — غازی ہے مردِ مومن مومن ہے مردِ غازی

حق العباد کو جو سمجھا ہے شیرِ مادر — بندہ خدا کا کب ہے اس رنگ کا نمازی

صحرائے زندگی میں بے راہ روائیں ہے
وہ قافلہ کہ جس کا سالار تھا حجازی!!

۱۹ر نومبر ۱۹۳۶ء

---

۱ پاکبازی - سب کچھ ہار دینا

غزل

جینا ہے اگر تجھ کو خوگر ہو تمنّا کا
انداز خلیلی ہے مسلک ہے یہ موسیٰ کا

بے آب تمنّا دل جذبات سے عاری ہے
منظر کبھی دیکھا ہے سوکھے ہوئے دریا کا

محبوب ہے مےکش کو رندوں کی بغل میں ہے
لیکن یہ تقرّب ہے بادہ ہی سے مینا کا

تھا جذب کشش جس میں وہ شمع تجلّی تھی
زائر ہو کوئی کیوں کر اب وادیِ سینا کا

چڑھتے ہوئے سورج کے تیور کبھی دیکھے ہیں؟
آغاز ہے آئینہ انجامِ تمنّا کا

اصلاح کی دنیا میں اُس دل کا خدا حافظ
پیدا نہ ہوا جس میں احساس ہی توبہ کا

سیکھا ہے ابھی میں نے ہاتف سے غزل کہنا
یہ نغمہ جاں پرور ہے بلبل سدرہ کا

۲۹ دسمبر ۱۹۳۶ء

غزل

کہتا ہے ذرّہ ذرّہ یہی کائنات کا
ہنگامۂ حیات ہے مقصد حیات کا

ہے منحصر عمل پہ نمود و نبودِ زیست
معیار ہے عمل ہی حیات و ممات کا

اے بے خبر عطیۂ فطرت کی قدر کر
ہے گنجِ شائیگاں یہی دل ممکنات کا

اپنی گرہ کو اپنے ہی ناخن سے کھول لے
تدبیرِ غیر نسخہ نہیں ہے نجات کا

اثباتِ ماسوا ہے حقیقت میں نفیِ خویش
توحید کا کمال ہے اثبات ذات کا

ممکن نہیں امینؔ حزیں "لامکاں" کی سیر
جب تک ہے دل اسیرِ طلسمِ جہات کا

۳۱ دسمبر ۱۹۳۶ء

غزل

توانا ہوں دلِ رنجور کی سوگند کیوں کھاؤں؟
میں جب مختار ہوں مجبور کی سوگند کیوں کھاؤں؟

مجھے عرشِ بریں کے جلوۂ دائم سے نسبت ہے
کوئی واعظ ہوں میں بھی؟ حور کی سوگند کیوں کھاؤں؟

مرا طورِ تجلی رات دن ہے میرے پہلو میں
نہیں جب آگ لینا طور کی سوگند کیوں کھاؤں؟

مرے ہر نا چکیدہ اشک کا قطرہ ہے بے ساحل
میں طوفانِ بلا۔ تنور کی سوگند کیوں کھاؤں؟

حقیقت میں مری خاموشیاں پردہ ہیں محشر کا
ہوں خود شورِ قیامت صور کی سوگند کیوں کھاؤں؟

اناالحق کی بجائے میں علی الحق کا ہوں آوازہ
پڑی ہے کیا مجھے، منصور کی سوگند کیوں کھاؤں؟
کلاہِ فقرِ حب میں نے ازل سے اوڑھ رکھی ہے
امیںؔ تو ہی بتا منصور کی سوگند کیوں کھاؤں؟

۱۱ر فروری ۱۹۳۷ء

نکات

زارنالی مرا اُصول نہیں
دعوتِ غم مجھے قبول نہیں

مثلِ نقطہ ہوں بے نیازِ جہات
میری دنیا میں عرض و طول نہیں

۲

پھول جبتک کھلا ہے خنداں ہے
رنگ و بُوئے چمن بداماں ہے

اک ذرا ہو گیا جو افسُردہ
گل وہیں عبرتوں کا ساماں ہے

۳

دل وہی پُر ملال رہتا ہے
جس کو غم کا خیال رہتا ہے

ایسے موذی کو دُور ہی سے سلام
جس سے دل پائمال رہتا ہے

۴

کیوں پرستش کرے بتِ غم کی؛
کیا پڑی ہے کسی کو ماتم کی ؛

عقل جذبات کی غلام نہ ہو
ہے یہی شانِ ابنِ آدم کی؛

۲۷. فروری ۱۹۳۷ء

غزل

وہ مرغ جس کی تگ و دو مجاہدانہ نہیں
گماں یہی ہے کوئی اس کا آشیانہ نہیں

نہ دے اس آگ کو نارِ خلیل سے نسبت
کہ جس کے سوز میں گلزار جاودانہ نہیں

شکستِ ہمتِ عالی ہے بیخودی کی تلاش
کہ کارخانہ ہے دنیا شراب خانہ نہیں

زبانِ حال سے کہتا تھا ایک مرغِ اسیر
قفس کے گوشے میں گلشن کا آب و دانہ نہیں

فلک سے اس لئے گاڑھی چھنی نہیں اپنی
مری سرشت میں حیلہ نہیں بہانہ نہیں

حیات بخش تو ہیں زمزمے مرے لیکن
چمن میں گوشِ گل و لالہ محرمانہ نہیں

اگرچہ آپ کی ہے مغربی تراش خراش
جو دل ملا ہے انہیں کو فرنگیانہ نہیں

---

۴ مارچ ۱۹۳۷ء

غزل

میں رندِ میکدۂ ہست و بود ہوں ساقی! کہ بزمِ ناز میں تیری نمود ہوں ساقی!
خودی کا جام مجھے دیکے دے دیا کیا کچھ! ترے ہی جود و سخا کا وجود ہوں ساقی!
شرابِ شوق صراحی میں تھی کہ برقِ نیاز ترے حضور سراپا سجود ہوں ساقی!
مری نگاہ کے پر لگ گئے ہیں پیتے ہی کرم سے تیرے سراپا صعود ہوں ساقی!
مرے پیالے میں دونوں جہاں ہیں عکس افگن میں اپنی ذات میں بزمِ شہود ہوں ساقی!
ادھر ہوں آئنۂ حسنِ بے مثال ادھر مثالِ خاکِ بچشمِ حسود ہوں ساقی!

میں بے خودوں کے لئے ہوں پیامِ شوقِ عمل
ابیس کے پردے میں تیرا سرود ہوں ساقی!

۸ر مارچ ۱۹۳۷ء

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
ہولے ہولے درد سہنے دیجئے
دیجئے اتنی اجازت دیکھ لیں
حالِ دل چاہے نہ کہنے دیجئے

۲

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
بے لبسی کے اشک بہنے دیجئے
ہم علاجِ درد کے قائل نہیں
داستانِ درد کہنے دیجئے

۳

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
خونِ دل آنکھوں سے بہنے دیجئے
لطف آجائیگا سنئے تو سہی
داستاں رنگیں ہے کہنے دیجئے

۴

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
بحرِ بے پایاں میں رہنے دیجئے
منہ میں جو آیا کہا اب ہم کو بھی
دردِ دل آنکھوں سے کہنے دیجئے

۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء

التجا

چیز ایسی ہی کوئی رندوں کے پیمانے میں ہو
جس سے سرشارِ یقیں ہو جو بھی میخانے میں ہو
عشق کی ہنگامہ آرائی ہے حسنِ شوخ سے
یادِ لیلیٰ کارفرما اپنے دیوانے میں ہو

۲

بے نیازِ بیکسی بیگانۂ حرماں رہیں
ہم سراپا اک تمنائے جنوں ساماں رہیں
دیکھتے ہی بھانپ لیں تقدیر کی افتاد کو
روشناس جوہرِ آئینۂ امکاں رہیں

۳

بیخودی ایسی کہ جو ہو مطلعِ مہرِ شعور
توڑ ڈالے اک نظر میں جو طلسماتِ ظہور
سرمۂ تسخیر وہ ہو چشمِ بینا کے لئے
جو حقیقت میں "ہو نفیِ غیب" "اثباتِ حضور"

۴

تشنہ کاموں کو مئے پندار پینے کو ملے!
ہم تہی جاموں کو آخر کچھ تو جینے کو ملے!
خلعتِ نو کے الٰہی ہم بھی ہیں اُمیدوار!
آج تک تو چاک ہی کمبخت سینے کو ملے!

اپریل ۱۹۳۷ء

تقدیر

جو ہر افتاد کو تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں — خود اپنی خود فریبی کی وہی تشہیر کرتے ہیں
یہ جبر و قدر کے مارے ہوئے نافہم کیا جانیں — ہمیں تخریب کرتے ہیں ہمیں تعمیر کرتے ہیں

۲

اِدھر تدبیر کرتے ہیں اُدھر تدبیر کرتے ہیں — کبھی تخریب کرتے ہیں کبھی تعمیر کرتے ہیں
تذبذب سے بگڑتے ہیں بسا اوقات کھیل اپنے — مگر ہم۔ جو بھی ہو۔ تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں

۳

فلک کو کوستے ہیں نالۂ شبگیر کرتے ہیں — جو پاداشِ عمل پر شکوۂ تقدیر کرتے ہیں
مکافاتِ عمل کا مسئلہ مشکل نہیں اتنا — یہ جنت ہو کہ دوزخ خود ہمیں تعمیر کرتے ہیں

۴

جو کل ہونا ہے اس کی آج ہی تدبیر کرتے ہیں — کہ دُور اندیش یوں تقدیر کی تعمیر کرتے ہیں
زبانِ فلسفہ میں "حال" کہتے ہیں اسی جسکو — ہم اپنی قسمتیں اس لوح پر تحریر کرتے ہیں

۱۱ اپریل ۱۹۳۷ء

دنیا بدلتی جائیگی

آپ بدلیں یا نہ بدلیں یہ بدلتی جائے گی　　دنیا بدلتی جائیگی
بے نیازِ بزم ہو کر شمع جلتی جائے گی　　دنیا بدلتی جائیگی
آفتابِ عصرِ نو مائل بہ پستی ہو چکا　　اس کا نصیبہ سو چکا
دھوپ اب نکلے نہ نکلے چھاؤں ڈھلتی جائیگی　　دنیا بدلتی جائیگی
گرمیٔ ہنگامۂ ہستی جنوں انگیز ہے　　اک فتنۂ چنگیز ہے
بیر بڑھتے جائینگے تلوار چلتی جائے گی　　دنیا بدلتی جائیگی
مادرِ گیتی کے دل سے ماممتا مفقود ہے　　رونا تڑلپے سُود ہے
اپنے ہی بچوں کو یہ ناگن نگلتی جائے گی　　دنیا بدلتی جائیگی
زید و عمرو بکر کوئی ہو کسی کی بھی نہیں　　دنیا ابیں دنیا ابیں
سب کی چھاتی پر یہ ظالم مونگ دلتی جائیگی　　دنیا بدلتی جائیگی

۱۸ر جون ۱۹۳۷ء

بلندیٔ نگاہ

نگاہ کی بلندیوں کا نام جانِ پاک ہے
جگر کی ارجمندیوں کا نام جانِ پاک ہے
ملا ہوا ہے مشتِ خاک کو جو وقفِ سوزِ دل
اسی کی دردمندیوں کا نام جانِ پاک ہے

۲

نگاہ کی بلندیاں بلندیٔ حیات ہیں
نگاہ کی بلندیاں عیارِ ممکنات ہیں
نگاہ کی بلندیوں کی انتہا نہیں کوئی
نگاہ کی بلندیاں جہانِ بے جہات ہیں

۳

نگاہ کی بلندیاں ہی عرش ہیں شعور کا
نگاہ کی بلندیاں ہی خم ہے ظہور کا
لطیف سی جھلک تھی اک بلندیٔ نگاہ کی
کلیم کو گماں ہوا تھا جس پہ شمعِ طور کا

۴

نگاہ کی بلندیوں کی زد میں ماورائے عرش
نگاہ کی بلندیوں کا منتہا خدائے عرش
نگاہ کی بلندیاں ہیں وہ بلندیاں کہ جو
نگاہِ اہلِ فکر میں ہیں اے امیں بنائے عرش

۳۰ر جون ۱۹۳۶ء

قوانینِ حیات

جھک گیا جو اور بھی اس کو جھکایا جائیگا　　دیدہ و دانستہ نظروں سے گرایا جائیگا
نقش جو کوشاں نہیں خود ہی اُبھرنے کیلئے　　آپ مٹ جائیگا یا اُس کو مٹایا جائیگا

۲

جھک گیا جو اور بھی اس کو جھکایا جائیگا　　دیدہ و دانستہ بے بس کو ستایا جائیگا
اک ذرا جسکی حمیّت کی رگِ جاں کٹ گئی　　خون پانی کی طرح اس کا بہایا جائیگا

۳

جھک گیا جو اور بھی اس کو جھکایا جائیگا　　دیدہ و دانستہ گرتے کو گرایا جائیگا
جس کسی سے کھنچ نہیں سکتی ہے تصویرِ حیات　　نقشِ باطل کی طرح اس کو مٹایا جائیگا

۴

جھک گیا جو اور بھی اس کو جھکایا جائیگا　　دیدہ و دانستہ خاطر میں نہ لایا جائیگا
جس نے سیکھے ہی نہیں آداب محفل کے ابھی　　دور بزمِ ناز سے اس کو بٹھایا جائیگا

۱۵ر جولائی ۱۹۳۷ء

نکات

ذرۂ ناچیز تعمیرِ بیاباں تجھ سے ہے
تو بظاہر خاک ہے لیکن خیاباں تجھ سے ہے
اپنے نورِ سرمدی یعنی خودی میں ڈوب جا
ماہ کا جلوہ ضیائے مہرِ تاباں تجھ سے ہے

۲

تیری ہیبت سے ستارے لرزہ براندام ہیں
مہر و مہ ہستی کے میخانے میں تیرے جام ہیں
کیوں خودی تیری نہیں بیتابِ ضربِ براہیم
تو خلیل اللہ ہے اور ماسوا اصنام ہیں

۳

بیخودی میخانۂ ہستی میں میخواری کی موت
شمع کی افسردگی اس کی ضیا باری کی موت
شعلہ کیا ہے، اک خس و خاشاک سوزی کا عمل
خود فراموشی خودی کی خوابِ بیداری کی موت

۴

ذہنیت ہی کے بگڑنے سے بگڑ جاتے ہیں کھیل
دب گیا تو ہو گئی جب ذہنیت تیری ذلیل
ذہنیت کی کیجیے اصلاح پہلے اے امیں
کیا جلے گا وہ دیا پانی ہوا ہو جس کا تیل

۲۲ جولائی ۱۹۳۷ء

قوانینِ خودی

خودی غلام سے مغفور ہو کے رہتی ہے
خودی مظفر و منصور ہو کے رہتی ہے

خودی کے چوٹ جب آئے علاج کر اس کا
یہ چوٹ بعد میں ناسور ہو کے رہتی ہے

خودی کی آنکھ نہ جھک جائے بزمِ مستی میں
کہ جھک گئی تو یہ بے نور ہو کے رہتی ہے

جب اس کی ہوتی ہے فرعونیوں سے آویزش
خودی کلیمؑ خودی طور ہو کے رہتی ہے

خودی پہ جان چھڑکتے ہیں جو وہ جانتے ہیں
کہ دب گئی تو یہ مقہور ہو کے رہتی ہے

خودی کا دل ہو اگر پاک بدگمانی سے
خودی کے سر سے بلا دور ہو کے رہتی ہے

خودی کی شان کی رفعت کی ہے دلیل ایں
کہ سعی اس کی ہی مشکور ہو کے رہتی ہے

۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء

شانِ انسان

تو بھی یگانہ ! میں بھی یگانہ ! — میں آشکارا تو غائبانہ
تو مدعا ہے میں مدعی ہوں — بربط کا مقصود کیا ہے؟ ترانہ
عنقا حقیقت کا تو ازل سے — تیرا ابد تک ہیں آشیانہ
مانندِ آئینہ اے حسنِ مطلق! — تیری نمائش کا ہوں بہانہ
تو قلزمِ زیست میں قطرۂ زیست — تو بے کرانہ ہیں بے کرانہ
بایں ہمہ آپ آقا میں بندہ — میری جبیں۔آپ کا آستانہ

شانِ خدا ہے یا شانِ انساں
دعویٰ نہیں یہ ایسا شاعرانہ

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء

خسران المبین

خودی کو بیچ کے صدق و صفا کو بیچ دیا　　متاعِ خانۂ شرم و حیا کو بیچ دیا
حرام اُس پہ ہے جینے کی آرزو جس نے　　سرے سے جینے ہی کے مدعا کو بیچ دیا

۲

خودی کو بیچ کے اپنی بقا کو بیچ دیا　　چمک تھی جس سے تری اس ضیا کو بیچ دیا
امیدِ لالہ و گل اب فضول ہے ناداں!　　کہ تو نے باغ کی بادِ صبا کو بیچ دیا

۳

خودی کو بیچ کے شانِ خدا کو بیچ دیا　　نظر کی وسعتِ لا انتہا کو بیچ دیا
یمِ حیات ترا کیوں نہ خشک ہو جائے؟　　کہ تو نے اس کے دُرِ بے بہا کو بیچ دیا

۴

خودی کو بیچ کے "فخرِ بجا" کو بیچ دیا　　حریفِ ارض و سما سی بلا کو بیچ دیا
تری نگاہ کو وسعت سے واسطہ کیا؟　　جب ابتدا میں ہی انتہا کو بیچ دیا

۱۲ر اکتوبر ۱۹۳ء

نکات

مقدر ہے نہ اسباب سیاسی
تری دشمن تری خود ناشناسی
خودی جس میں نہیں لاشے ہے وہ زیست
نہیں فطرت کا یہ فتوئ قیاسی

۲

خودی سے ہے نمودِ ابنِ آدم
اسی جوہر سے مٹی میں ہے دم خم
ہمیں مارا ہماری بے خودی نے
خودی کے ساتھ ہی جاتے رہے ہم

۳

فریبِ بیخودی کھائے ہوئے ہیں
چمک کیا ہو کہ گہنائے ہوئے ہیں
جگہ ملتی نہیں ہے بیٹھنے کو
جبھی محفل میں گھبرائے ہوئے ہیں

۴

خودی جس میں نہیں بے آبرو ہے
وہ گویا خشک سی اک آبجو ہے
یہی ہونے نہ ہونے کا ہے معیار
اگر تجھ میں خودی گم ہے تو تو ہے

۱۸ راکتوبر ۱۹۳۷ء

حقائق

کیا پوچھتے ہیں ہمدم میں کیا لئے ہوئے ہوں؟ — بیتابیوں کی دل میں دنیا لئے ہوئے ہوں
ہر قطرہ خونِ دل کا ہے ایک موجِ مضطر — کوزے میں یعنی میں اک دریا لئے ہوئے ہوں

۲

کچھ ایسے بہ رہے ہیں دریائے رنگ و بو میں — گویا کہ بلبلے ہیں دامانِ آب جو میں
رازِ درونِ شیشہ کا ہوش کس کو آئے؟ — نظریں گڑی ہوئی ہیں رنگینیٔ سبو میں

۳

دھوکے میں آگئے ہیں مسحور ہو گئے ہیں — رنگینیٔ سبو سے مسرور ہو گئے ہیں
اتنے قریب آکر ہم تجھ سے اے حقیقت! — کیوں دُور جا پڑے ہیں کیوں دُور ہو گئے ہیں

۴

چیلا برہمنوں کا محمود ہو چکا ہے — مقصود زندگی کا مقصود ہو چکا ہے
تھا جس سے دل منوّر ایقان کا وہ شعلہ — بے اعتقادیوں سے نابود ہو چکا ہے

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء

اس جام کا پینا جینا ہے

۱

ہوتا ہے یہی اس عالم میں تخریب بھی ہے تعمیر بھی ہے
اس گنگا جمنی دنیا میں تدبیر بھی ہے تقدیر بھی ہے
روتے ہیں کبھی ہنستے ہیں کبھی پہلو ہیں یہی دو جینے کے
کچھ اس کی کچھ اُسکی گھاتیں ہیں صیّاد بھی ہے نخچیر بھی ہے

۲

پیمانِ وفا کعبے میں بندھا اور لوٹے گئے بُت خانے میں
لاہوتی مے بھر دی ساقی نے ناسوتی پیمانے میں
حیرت سے جو فطرت کو دیکھا وہ اُلٹا پوچھنے مجھ سے لگی
آتا ہے نظر جو تجھ کو شجر تھا مٹی میں یا دانے میں؟

۳

گو دانے کے اندر ہی تھا شجر مٹی میں پلا مشہود ہوا
غائب میں ہیولا سا تھا جو۔ وہ حاضر میں موجود ہوا
تکمیلِ محبت ہی کے لئے یہ کھیل کسی نے کھیلا ہے
ابلیس یہی تو سمجھ نہ سکا ناری وہ جبھی مردود ہوا

۴

اک جوہر ہے آئینے میں جس جوہر سے آئینہ ہے
اک نورِ تجلّٰی ہے گل میں گل جس سے طور ہے سینا ہے
اک جام امیں ہے ناسوتی مے جس میں بھری ہے لاہوتی
ساقی نے جبھی تو فرمایا " اس جام کا پینا جینا ہے "

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء

خودی خدائے خودی کے حضور میں

جبرئیل

خودی حضور میں حاضر ہے اے خدائے خودی
بصد نیاز سرِ عجز کو جھکائے ہوئے

ضرور بات ہے کوئی کہ ہے سر افگندہ
خودی کو آج ہی دیکھا ہے منہ بنائے ہوئے

ہمارے سجدوں ہی سے پھر گیا تھا سر اسکا
تھی جب سے دہر میں یہ آگ اک لگائے ہوئے

نہیں تمیز اسے گو سلام کی یا رب!
خودی کو بخش اجازت کلام کی یا رب!

خدائے خودی

خودی سے چھیڑ یہ اچھی نہیں ہے اے جبریلؑ
خودی حضورِ خدا میں خودی نہیں رہتی

خودی کا مدِ مقابل ہے ماسوائے خودی
خودی ہر ایک کے آگے جھکی نہیں رہتی

ہے لطف اسی میں کہ سائل زباں سے ہو گویا
اگرچہ مجھ سے کوئی شے چھپی نہیں رہتی

خودی کو اذن ہے سو بار لب کشائی کا
کہ آج اس کو ہے احساس نارسائی کا

خودی

قدیم و قائم و قیوم و قادرِ مطلق — تری جناب میں حاضر ہے فخر و ناز ترا
وہی فرشتوں کی مسجود خود ہے سر بہ سجود — جسے ملا تھا سر و پائے علّم الاسما ع۱
نہیں ہے اہل ہی جب جبرئیل کیا جانے — مرے خیال کی کاوش دماغ کا سودا

خودی کی اصل اگر تیرا نور ہے یا رب!
خودی بری ہو تو کس کا قصور ہے یا رب!

خدائے خودی

خودی وہ جذبۂ بے اختیارِ ذاتی ہے — ازل سے جس سے حفاظت ہے ذات کی مقصود
غرور کہتے ہیں جس کو خودی کا ہے ہمزاد — مگر وہ لغو سراپا یہ سربسر محمود
اخوت اور سلامت روی خودی کا شعار — مثالِ مہرِ جہاں تاب اس کا ذوقِ نمود

خودی نے جس کو نوازا وہ باکمال ہوا
خودی سے قوموں کا اقبال لازوال ہوا

ع۱ تلمیح بہ آیۂ کریمہ وعلّم آدم الاسماء کلّھا۔ سکھائے آدم کو اسما سب کے سب

۱۳ نومبر ۱۹۳۷ء

خزاں

یہ سرخ و زرد دام ہے؛ کہ بے خودی کا جام ہے
شفق کا اہتمام ہے؛ کہ وصل کا پیام ہے   خزاں نمو کی شام ہے!
حیات آب جو سے تھی بہار رنگ و بو سے تھی
نمودِ گل نمو سے تھی نمو کا اختتام ہے   خزاں نمو کی شام ہے!
گلوں کے قہقہے نہیں چمن میں چہچہے نہیں
طیور رہ گئے نہیں دنوں ہی کا قیام ہے   خزاں نمو کی شام ہے!
فلک سے قافلہ چلا ورود کوہ پر ہوا
وہاں سے دشت کو ڈھلا چمن میں اب قیام ہے   خزاں نمو کی شام ہے!
نہیں یہ سست بے سبب بہار تک ہے اس کی شب
مزے سے سو رہے گی اب کہ ختم اس کا کام ہے   خزاں نمو کی شام ہے!

۱۵ ر نومبر ۱۹۳۷ء

حقائق

حسن کا اہتمام تیرے لئے
جلوۂ صبح و شام تیرے لئے

اور کیا چاہیئے تھا اے کفِ خاک!
عاشقی کا مقام تیرے لئے

۲

مے و مینا و جام تیرے لئے
ہے یہ سب اہتمام تیرے لئے

اے کفِ خاک! اپنی آنکھ تو کھول
حسن کا فیضِ عام تیرے لئے

۳

ہر قدم پر ہے دام تیرے لئے
ہفتخواں گام گام تیرے لئے

لیکن اے مشتِ خاک یہ بھی تو دیکھ
ہے بقائے دوام تیرے لئے

۴

چاند سورج کے جام تیرے لئے
ان کی گردش مدام تیرے لئے

پی کے بدمست ہو نہ اے کفِ خاک!
بے خودی ہے حرام تیرے لئے

۱۸ نومبر ۱۹۳۷ء

نکات

خفتہ ہے خودی جس کی ناقص ہے شعور اسکا
بے نطق کلیمؑ اُس کا بے شعلہ ہے طور اسکا

آئی ہی نہیں جس کے لب تک تہ مئے باقی
بے کیف حیات اس کی بے لطف سرور اسکا

۲

احساس خودی ہی سے بلبل کا ترانہ ہے
پھولوں کی دل آویزی رنگین بہانہ ہے

احساس خودی سے ہے احساس حقیقت کا
یہ ربط نہیں جس میں بے ضبط فسانہ ہے

۳

دریا کے تموّج میں دریا کی خودی پنہاں
گوہر کے تجمّل میں قطرے کی خودی نماں

ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو
مہر و مہ و انجم میں ہے ان کی خودی تاباں

۴

بادل کی گرج میں ہے بادل کی خودی مضمر
بجلی کی تڑپ میں ہے بجلی کی خودی مضمر

کہتے ہیں خودی جس کو آئینہ ہے جوہر کا
بن اس کے ایں جوہر رہتا ہی نہیں جوہر

۱۰ ردسمبر ۱۹۳۷ء

غزل

دیکھتے ہی جس کو دل محوِ تماشا ہو گیا
دل کا وہ ہو یا نہ ہو دل تو اسی کا ہو گیا

حسن کے رخسار پر آنسو مچل کر کیا گرے
عشق کی نظروں میں سونے پر سہاگا ہو گیا

عشق کی تکمیل کی دیکھیں یہی دو صورتیں
دل کا سودا ہو گیا یا دل کو سودا ہو گیا

تھا وہی آنسو مرا تاثیر میں ڈوبا ہوا
جو کبھی شکوہ کبھی حرفِ تمنّا ہو گیا

جینے جی کب چھوڑنے کی تھی انابت آپ سے
مر گیا دل عشق کی منزل میں اچھا ہو گیا

درد کی دنیا ہے ناصح اک طلسمِ زندگی
بھول کر بھی اس میں جو پہنچا یہیں کا ہو گیا

اس کو کہتے ہیں رضائے دوست کی منزل امیں
حسن کا منشاء دلِ عاشق کا منشا ہو گیا

۱۵ر جنوری ۱۹۳۰ء

نکات

صورتِ جمعیّتِ خاطر پریشانی مری ذوقِ نظّارہ کی اک تصویر حیرانی مری
دردِ دل پر جذبۂ سعی و عمل کا انحصار اور جگر کے سوز کی مرہون تابانی مری

۲

بے سر و سامانیاں سامانِ آزادی مرا چشمۂ غم اصل میں ہے منبعِ شادی مرا
صبحِ وصلِ یار کا مژدہ شبِ تاریکِ ہجر ولولہ تعمیرِ نو کا شوقِ بربادی مرا

۳

مشکلیں سنگِ فساں ہیں تیغِ جرأت کیلئے ٹھوکریں ہیں تازیانہ اسپِ ہمّت کیلئے
وہ بھلا خاطر میں کیا لائیں تجھے چرخِ کبود! نردباں پستی ہے جن کی عرشِ رفعت کیلئے

۴

”موت سے بیگانگی“ ہیں سطوت و شانِ حیات ”موت سے بیگانگی“ ہی اصلِ ایمانِ حیات
ہے انہیں کی زندگی وہ اہل ہیں اسکے امیں ”موت سے بیگانگی“ ہے جن کا عنوانِ حیات

۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء

غزل

زندگی کے تلخ تر ہونے کے ساماں دیکھئے
آپ اپنی جان کا دشمن ہے انساں دیکھئے

سامنے ہے عقل کی جدت طرازی کا مآل
کس قدر اب ہو گئی ہے موت ارزاں دیکھئے

عشق کے پیچھے پڑی تھی عقل پیچھے جھاڑ کر
خود بخود ہوتے لگی دل میں پشیماں دیکھئے

دور دورہ ہے فریب و مکر و حرص و آز کا
مٹ گئے صدق و صفا نیرنگِ دوراں دیکھئے

نوجوانوں کی جوانی پڑھ کے پھیکی پڑ گئی
رنگ کیا لاتی ہے اب تعلیم نسواں دیکھئے

ایک نے بُت بیچ کھائے دوسرے نے مسجدیں
برہمن کا دھرم اور مُلا کا ایماں دیکھئے

ہوش کی باتیں امیں اسیوں سے ممکن ہی نہیں
ان کا دامن دیکھئے ان کا گریباں دیکھئے

۱۰ فروری ۱۹۳۶ء

نکات

۱

باعثِ ذلّت ہوئیں مجبوریاں
مجھ کو لے ڈوبیں مری مجبوریاں

بے ستوں کا عیشِ شیریں کے لئے
کوہ کن کرتا پھرے مزدوریاں

۲

مستیوں سے حسن کو فرصت کہاں
جھیلتا ہے عشق یونہی سختیاں

ایک کی تابِ تواں وقفِ نیاز
ایک کی رعنائیاں تابِ تواں

۳

جب نہ ہو اپنی خودی کا پاس ہی
کس طرح ذلّت کا ہو احساس ہی

کاغذی پھولوں کو دیکھا ہے ابھی
اور سب کچھ ہے نہیں بو باس ہی

۴

جان سے جس کو خودی پیاری نہیں
وہ شریکِ بزمِ خودداری نہیں

چشمِ دل بھی کھول کر رکھئے جناب
آنکھ کا کھلنا ہی بیداری نہیں

۱۳ فروری ۱۹۳۰ء

معارف

زندگی رہ گذارِ موت نہیں زندگی خارزارِ موت نہیں
زندگی زندگی ہے سرتاپا زندگی انتظارِ موت نہیں

۲

ہے یہ دنیا اسے دوام نہیں یہ جہاں عیش کا مقام نہیں
رزمِ ہستی میں ہو دھنی اس کا زندگی تیغ ہے نیام نہیں

۳

زندگی موت سے لڑائی ہے وہی مرتا ہے جس کی آئی ہے
موت سے ڈر کے جیتے رہنے میں جگ ہنسائی ہے جگ ہنسائی ہے

۴

مے نہیں جس میں وہ نہیں مینا دل نہیں جس میں وہ نہیں سینہ
موت بہتر ہے ایسے جینے سے ڈر کے جینا بھی ہے کوئی جینا؟

۱۳ر فروری ۱۹۳۶ء

دُعا

تمنا مجھ کو اک ایسی عطا ہو ! یہ دل جس سے شہیدِ مدعا ہو
اٹھے جذبات کا طوفان ایسا کہ رگ رگ میں مری محشر بپا ہو

۲

بدل میرے دلِ بے آرزو کو! الٰہی! کیا کروں خشک آبجو کو؟
بہت تنگ آکے اکثر چاہتا ہوں مسل دوں غنچۂ بے رنگ و بو کو

۳

دلِ بے مدعا بھی کوئی دل ہے؟ بغل میں بے ثمر پتھر کی سل ہے
نہیں اُگتا جہاں تخمِ تمنا زمینِ شور ہے بے فیضِ گل ہے

۴

مری دنیائے دل پر از سرِ نو پڑے امید کے سورج کا پرتَو
الٰہی جس سے اسکی زندگی تھی لگا دے میرے دل کو پھر وہی لَو

۲۵ رفروری ۱۹۳۶ء

حیاتِ طیّبہ

والد ماجد قبلہ جناب مولوی احمد دین صاحب مرحوم ومغفور کی دردانگیز یاد میں

جن کا ۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو وصال بحق ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

زیست کیا شے ہے؟ حیاتِ جاوداں کیا چیز ہے؟
وہ نشاط انگیز کیوں؟ یہ کیوں سرور انگیز ہے؟
رازِ ہستی ابتدا سے آج تک کیوں راز ہے؟
ساز ہے خود زندگی یا ساز کی آواز ہے؟
ایک کیفیت عرض کی ہے کہ جوہر زندگی؟
اکتسابی ہے کہ ذاتی زیست کی تابندگی؟

آشنائے زندگی ناآشنائے زندگی!
کیا کرشمہ ہے ترا یہ بھی خدائے زندگی!

۲

رفعت و پستی کے جذبات دوگونہ کا جہاں؛
جس کی شمشیرِ دودم کا ماسوا سنگ فساں؛
منبعِ یاس و یقیں سرچشمۂ نورِ شعور
اک کرشمہ جس کا ہے فرعون و موسیٰ کا ظہور
وہ بلا وہ خیر و شر کا امتزاجِ بہتریں
سر بسر احساس سر تا پا نگاہِ نکتہ بیں
"الامانت" قلبِ انساں گوہرِ عز و شرف
فخرِ یزداں اہرمن کے تیرِ کینہ کا ہدف

۳

یہ امانت مشعلِ اناھدینا ہ السبیل
مہرِ تاباں کی طرح ہے آپ ہی اپنی دلیل

وید کیا۔ توریت کیا۔ انجیل کیا قرآن کیا
عقل کیا وجدان کیا برہان کیا عرفان کیا
"الامانت" کے تحفظ پر ہیں سارے یک زباں
اور صلہ اس کی حفاظت کا حیاتِ جاوداں

یہ شعارِ سرمدی جس کی دلیلِ راہ ہو
ظلمتِ راہِ عدم کی اس کو کیا پرواہ ہو

۴

اے وحیدِ عصر اے علّامۂ دینِ متیں
عمر بھر اللہ کے آگے جھکی تیری جبیں
نوجوانی کیا کہولت کیا بڑھاپا کیا ترا
اتقا کے ارتقا کا تھا مسلسل سلسلہ
ابتدا سے زندگی تیری سراپا حال تھی
فقر کی دولت سے پر دامن تھی مالا مال تھی

اس سے بڑھکر کیا گواہی ہو ترے عرفان کی
اپنے مولا کو نمازِ فجر پڑھتے جان دی

۵

ظاہر و باطن جہاں میں جس کسی کا ایک ہے
برگزیدہ ہے وہی بندہ خدا کا نیک ہے
درحقیقت ہے حیاتِ طیّبہ وہ زندگی
شمع کے مانند جس کا کام ہو تابندگی
خوف ہے اللہ کا جس کو وہی انسان ہے
اہلِ دِل کے ہاں یہی انسان کی پہچان ہے

اے خنک مرقد! خدا کے بندۂ افرشتہ خو
کیوں نہ ہو ماتم ترا خانہ بخانہ کو بکو؟

۶

فخر ہے مجھ کو کہ ایسے باپ کا فرزند ہوں

علم کی دولت سے مالا مال ہوں خرسند ہوں
کس زباں سے اس عنایت کا ادا ہو شکریہ؟
فقر و رشد میں مجھے دے کر سبھی کچھ دے دیا
زندگی میں جو دعائیں میری حرزِ جاں رہیں
بھول جانا مشفقِ صادق! نہ جنّت میں کہیں

المدد اللہ کے پیارے نڑا پیارا ہوں میں
رہنمائی کر کہ تیری آنکھ کا تارا ہوں میں

۱۷ / اپریل ۱۹۳۶ء

رمزِ لاتثریب

غیرتِ دل چاہتی ہے رنج کا لوں انتقام آیۂ السن بالسن[۱] میں ہے جس کا جواز
اپنی فطرت کی بلندی سے مگر مجبور ہوں جانتی ہے جو ازل سے عفو کی رفعت کا راز

۲

عفو سے آئینۂ دل کا اتر جاتا ہے زنگ عفو ہی مرہم ہے ناسورِ کدورت کیلئے
دوستی کا دشمنِ جاں ہے خیالِ انتقام درگذر ہے بہترین مسلک اخوت کیلئے

۳

رازِ لاتثریب[۲] کو جب تک نہ سمجھیگا کوئی وہ اخوت کی صلاحیت کے قابل ہو چکا
غنچۂ دل سے اگر آتی ہو بوئے انتقام وہ کلاہِ مرد کی زینت کے قابل ہو چکا

۴

اپنی فطرت کی بلندی کا نہیں جس کو خیال وہ بہیمیت کے صحرا میں ہے سرگرداں ابھی
رمزِ لاتثریب[۲] کا پانا نہیں آساں امیں عفو کے اسرار نادانوں سے ہیں پنہاں ابھی

[۱] آیۂ کریمہ دانت کا بدلہ دانت [۲] آیۂ کریمہ آج تم سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوگی۔ ۲۴؍اپریل ۱۹۳۷ء

حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ
کی درد انگیز یاد میں

۱

بندۂ حق گذارِ مولاہی خادم خواستگارِ مولاہی عاشق جاں نثارِ مولاہی

مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

درد کا اک جہان ہو جسمیں ۔ بے نیازی کی شان ہو جسمیں ۔ فقر کی آن بان ہو جسمیں

مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

جس کو رازِ حیات ہو معلوم ۔ وسعتِ ممکنات ہو معلوم ۔ مقصدِ کائنات ہو معلوم

مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

نور افشاں ہو زندگی جسکی ۔ مہرِ تاباں ہو زندگی جسکی ۔ فخرِ انسان ہو زندگی جسکی

مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

ذات سے جسکی ہو ظہورِ خودی۔ جس نے پی ہو مئے طہورِ خودی۔ بیدھڑک پھونکدے جو صورِ خودی

مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

جس نے مولا سے لو لگائی ہو۔ اپنے مالک کا جو فدائی ہو۔ جسکی محبوب تک رسائی ہو

مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

مردِ مومن تھے حضرت اقبال

شاہد اِس کا ہے ان کا حال و قال

۲

مئے باقی کا جام تھے اقبالؔ۔ زندگی کا پیام تھے اقبالؔ۔ مومنوں کے امام تھے اقبالؔ

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!

قلزمِ علم کے شناور تھے۔ حکمتِ نادرہ کے دفتر سے۔ ان کے جوہر عجیب جوہر تھے

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!

ہند میں ایک ہی مسلماں تھے۔ اہلِ مشرق کے مہرِ تاباں تھے۔ یعنی دانائے رازِ انساں تھے

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!

قوم کیوں آج بیقرار نہ ہو؛ قوم کیوں آج اشکبار نہ ہو؛ قوم کیوں آج سوگوار نہ ہو؛

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!

"پیرِ ہندی" ترا انداز آگیں تیرا شیدا ترا امینِ حزیں۔ نوحہ گر کیوں نہ ہو بصدق و یقیں؛

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!

رحمتِ ذوالجلال تجھے اقبال

آپ اپنی مثال تجھے اقبال

۱۲ر مئی ۱۹۳۸ء

حیرتِ دل

حیرتِ آئینۂ دل چشمِ بینا ہو گئی　　کثرتِ جلوہ سے گویا طور و سینا ہو گئی
آ گیا مجھ کو مئے دیدار کے پینے کا لطف　　ہر نگاہِ شوق شکلِ جام و مینا ہو گئی

۲

حیرتِ دل جادۂ نظارۂ بامِ شعور　　حیرتِ دل سجدۂ اوّل بدرگاہِ حضور
حیرتِ دل اضطرابِ آرزو کا اک سکوں　　حیرتِ دل داستانِ حضرتِ موسیٰ و طور

۳

حیرتِ دل معنئِ اِنّا ھدینٰہ السبیل　　حیرتِ دل مبداءِ عرفان و ایقانِ خلیل
حیرتِ دل پنجۂ مشکل کشائے مشتِ خاک　　حیرتِ دل خاکیوں کے مجد کی محکم دلیل

۴

حیرتِ دل مقتضائے اوّلینِ عقل و ہوش　　حیرتِ دل اے امینِ نقشِ شعورِ بے خروش
حیرتِ دل رزمِ ہستی کی تفنگِ شعلہ بار　　حیرتِ دل بزمِ ہستی کی نگاہِ مے فروش

۲۲ مئی ۱۹۳۸ء

نگاہِ شوق

کمندِ شوق سے بچنا محال ہے اُس کا — ستارہ ہو کہ قمر ہو کہ مہرِ تاباں ہو
نگاہِ شوق سے ممکن نہیں رہے اوجھل — جمال ہو کہ حقیقت کہ ذاتِ یزداں ہو

۲

نگاہِ شوق کے اعجاز کا نہ ہو منکر — خُمِ شعور کا جامِ جہاں نما ہے یہی
تڑپ سے اس کی نہ ہو بے قرار اے ناداں! — جہاں میں شور ہے جس کا وہ ارتقا ہے یہی

۳

نگاہِ شوق نہیں جس کی چشمِ پہلو میں — وہ کورِ ذوق ہے سوزِ دروں سے بیگانہ
ہوا اس پہ خاک اثر شمع کی تجلّی کا — ملی نہیں ہے مگس کو نگاہِ پروانہ

۴

شکست کھا نہیں سکتی نگاہِ شوق کبھی — ہزار پردوں میں مطلوب چھپ کے جا بیٹھے
اسی کا نام امیں ہے کمالِ جذبۂ شوق — کھنچا ہوا کوئی پہلو میں خود سے آ بیٹھے

۲۴ر مئی ۱۹۳۵ء

گل و خار

گل

غنچے نے کہا وقتِ سحر خار سے ہنس کر — دامن نہ پھٹے میرا تری نوک میں پھنس کر
تذلیل نہ کرنا مری شاہانہ قبا کی — دیتا ہوں قسم تجھ کو میں بلبل کے خدا کی
یہ میری جھلک حسنِ حقیقی کی ادا ہے — اس رنگ کے پردہ میں جو یوں جلوہ نما ہے
مقصود مری ذات کا زینت ہی نہیں ہے — وہ جذبِ کشش میری رگِ جاں کی مکیں ہے
ہے دعوتِ نظارہ جو ہر اہلِ نظر کو — ق — چٹکے ہوئے جو مجھ سے ہے بلبل کے جگر کو
وابستہ مرا نور ہے سورج کی کرن سے — ہوں بڑھ کے کبھی نافۂ آہوئے ختن سے

میں شاہِ گلستاں ہوں نہ چھو میری قبا کو
بوسے کی اجازت ہے فقط بادِ صبا کو

۲

خار

تو نازِ چمن زخمہ زنِ سازِ چمن ہے
گویا تو ہی پیدا کنِ آوازِ چمن ہے

شاہی سے تری کس کو ہے انکار چمن میں؟
میں بھی تو نگہباں ہوں تری تلوار چمن میں

میں تیری حفاظت پہ کمر بستہ ہوں دن رات
محبوب ہے اس درجہ مجھے خود ہی تری ذات

میں مثلِ سناں تیرے ہی دشمن کے لئے ہوں
پتوں میں نہاں تیرے ہی دشمن کے لئے ہوں

ہاں مست اگر ہو کے تو الجھا کبھی مجھ سے
بے طرح الجھنا مجھے پڑ جائے گا تجھ سے

ذلّت یہ خودی میری گوارا نہ کرے گی
اس وقت کوئی پاس تمہارا نہ کرے گی

ہے مجھ سے بچانا ہی اگر اپنی قبا کو
کر دیجئے تنبیہ ذرا بادِ صبا کو

۲۴ جون ۱۹۳۶ء

نکات

نگاہ بھی ہے یہ دل حاصلِ نگاہ بھی ہے
مثالِ جادہ یہ جادہ بھی خضرِ راہ بھی ہے

اسی لئے اسے کہتے ہیں اہلِ دل بربط
کہ واہ واہ بھی ہے اسمیں آہ آہ بھی ہے

۲

بلند کرتی ہے دل کو نگاہ کی مستی
اِسی سرور کا فقدان ہے غائتِ پستی

خودی نگاہ سے ہے اور شعور سے ہے نگاہ
غرض شعور سے قائم ہے خاک کی ہستی

۳

نگاہِ شوق ہے گو ذوقِ جستجو کی دلیل
اسی سے گو شررِ زندگی ہے نارِ خلیلؑ

اگر پلید ہو باطن تو موردِ لاحول
سرشت پاک ہو اسکی تو رشکِ صد جبریلؑ

۴

نگاہِ دیدۂ نمناکِ صاحبِ ادراک
گذر کے شوق کے شعلے میں ہو گئی ہو جو پاک

کمند ہے وہ ابیسِ مہر و ماہ و انجم کی
اُسی کا صیدِ زبوں شہپرِ فطرتِ چالاک

۳۰ رجون ۱۹۳۶ء

غزل

میں خود ساقی ہوں اپنا میرے پہلو میں ہے پیمانہ
وہ پیمانہ کہ خود مینا بھی ہے اور خود ہی مے خانہ

اگر شمعِ حقیقت کی ضیا باری نہیں ہر سُو
تخیل کو کہاں سے آ گئے آدابِ پروانہ؟

پرِ پرواز بخشے مجھ کو میرے عشق و مستی نے
حقیقت سے جبھی دلچسپ تر ہے میرا افسانہ

مقامِ حیف و حیرت ہے کہ اس کو ہی مسل ڈالا
نمو سدرہ کی اپنے سینے میں رکھتا تھا جو دانہ

وہی اس بزمِ ہستی سے سرور اندوز ہوتے ہیں
نگاہیں جن کی ہوں بے باک اور اطوار مردانہ

مجھے اہلِ نظر کی آنکھ ہی پہچان سکتی ہے
کہ صورت تو ہے رندانہ مگر سیرت حکیمانہ

ابھی ہے داد کے قابل وسیع المشربی میری
کہ فرزانوں میں فرزانہ ہوں دیوانوں میں دیوانہ

۱۶ جولائی ۱۹۳۶ء

حقائق

غم سے آزاد بھی تو رہ نہ سکا
وقفِ فریاد بھی تو رہ نہ سکا

دھوپ چھاؤں تھی اِک بجز اس کے
اور کچھ یاد بھی تو رہ نہ سکا

۲

رنج و راحت کا سلسلہ ہے حیات
رات میں دن ہے اور دن میں ہے رات

منہ ہے کڑوا کبھی کبھی میٹھا
کھائے جاتے ہیں حنظل اور نبات

۳

راحتیں سازگار رہ نہ سکیں
کلفتیں غمگسار رہ نہ سکیں

کیا خزاں کیا بہار دونوں ہی
باغ میں نے سوار رہ نہ سکیں

۴

رنج اٹھاتے ہیں راحتوں کیلئے
راحتیں ہیں قباحتوں کے لئے

حالتِ رنج ہو کہ راحت ہو
جان اپنی ہے جراحتوں کیلئے

۲۷ر جولائی ۱۹۳۸ء

زکات

جنوں ساماں نہ ہو جو آرزو وہ آرزو کیسی؟ — نہ ہو روشن مثالِ مہر جو وہ مدعا کیسا؟
نہ ہو جو سعیِ پیہم سر بسر وہ جستجو کیسی؟ — نہ ہو جو رشکِ صد آئینہ وہ صدق و صفا کیسا؟

۲

جو منزل کو نہ اُٹّھے خود بخود ہی وہ قدم کیسا؟ — جو اُٹھتے ہی نہ چھا ماحول پر جائے نظر کیسی؟
جبیں سا جس کے در پر ہو نہ کوئی وہ حرم کیسا؟ — صدف تک ہی جو ہو محدود وہ تابِ گہر کیسی؟

۳

وہ کیا زخمہ جو سازِ دل کو چھوتے ہی نہ تڑپا دے — نہ ہو الہام جو وہ بربطِ حق کی نوا کیسی؟
وہ کیا نغمہ جو چھڑ کر ساری محفل کو نہ گرما دے — نہ ہو جو انتہا کا آئینہ وہ ابتدا کیسی؟

۴

مثالِ شعلۂ لالہ جو ہو سوزِ بروں کیسا؟ — جو شاخِ تاک میں روپوش وہ دختِ رز کیسی؟
نہ ہو روشن جو مثلِ شمع وہ سوزِ دروں کیسا؟ — امیں نخچیر کو جو بھاگ جانے دے وہ ڈر کیسی؟

۱۷ اگست ۱۹۳۸ء

لا یغیر اللہ بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم

فطرت چالاک سے رہتی ہے اکثر گفتگو
کس طرح بن کر بگڑ جاتی ہیں اقوام و ملل؟
ایک ہی قانون ہے تعمیر اور تخریب کا
اور اُس کی دسترس میں ہیں سب اسباب و علل
نام اس قانونِ قدرت کا ہے "تغییرِ خودی"
موت ملت کی خودی کی استواری میں خلل،

۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء

نکات

خودی جو شیفتۂ لذتِ نمود نہیں — وہ ایک سایۂ تاریک ہے وجود نہیں
نمود سے ہے وجود اس کا مثلِ شعلۂ برق — خودی وہ آتشِ امیں ہے جس کا دود نہیں

۲

نمود سے ہیں مہ و مہر آپ اپنی دلیل — نمودِ جوہرِ ذاتی سے ہے جمالِ جمیل
خودی جو اپنی نمائش سے جھینپ جاتی ہے — وہ یا تو مردہ ہے یا دب کے ہوگئی ہے رذیل

۳

نمود ہی ہے ثبوتِ وجودِ شئے ناداں! — نمود ہی سے چمکتا ہے جوہرِ پنہاں
خودی کو بہرِ خدا دے نمود کا موقع — کہ ہے یہ آئینۂ ممکناتِ بے پایاں

۴

نمود جو نہیں رکھتا وجود ہی کیسا؟ — جو آگ کا نہ ہو مخبر وہ دود ہی کیسا؟
اثر پذیر نہ ماحول ہو سکے جس سے — تمہیں بتاؤ امیں وہ شہود ہی کیسا؟

۳؍ اکتوبر ۱۹۳۶ء

حقائق

گڑی ہوئی ہے زمیں میں تری نظر ناداں!
تجلیاتِ فلک کی تجھے خبر ہی نہیں
فضا میں اڑنے کے جذبات کیا ہیں کیا جانے
وہ چیونٹی کہ نصیبوں میں جسکے پر ہی نہیں

۲

خیالِ محض کجا اور کجا عملِ ناداں!
سراب ہو نہیں سکتا علاجِ تشنہ لبی
وہ ایک صیدِ زبوں ہے فلک کی نظروں میں
عزیز جس کو نہیں شیوۂ جفا طلبی

۳

تڑپ ہے برق کے مانند جن کے پہلو میں
نگاہ ان کی ہے عقل ان کی ہے شعور ان کا
ہمالیہ کی طرح جن کی ہو خودی محکم
نمود ان کی ہے شان ان کی ہے ظہور ان کا

۴

جو ہو نہ دامِ حقیقت وہ دیکھنا کیسا ؟
برائے نام ہے جس آنکھ میں نظر ہی نہ ہو
گھٹا فضا میں اگر ہو تو بجلیاں کوندیں،
تڑپ کہاں سے امیں آئے جب جگر ہی نہ ہو

۱۶ / اکتوبر ۱۹۳۶ء

اقبال رحمۃ اللہ علیہ بارگاہِ باری تعالےٰ میں

جبریلؑ

ترے حبیبؐ کا عاشق ترا وہ عبدِ منیب
فضائے قدس میں محفوظ ہے نوا جس کی

وہ نکتہ سنجِ حقیقت وہ رازدانِ حیات
لئے صواب کا پہلو تھی ہر خطا جس کی

وہ مستِ بادۂ معنی وہ رندِ کعبہ نشیں
کلیدِ گنجِ اجابت رہی دعا جس کی

خودی کی آیۂ محکم کا شارحِ اعظم
بندھی ہوئی ہے فرشتوں میں بھی ہوا جس کی

جسے مشیتِ رحمت نے تھا بلا بھیجا
سلامِ مولا کو وہ عبدِ حر ہے آ پہنچا

باری تعالیٰ

جو میری رحمتِ مخصوص کا ہے پا انداز
ذرا دکھا مجھے پہلے بچھا کے اے جبریلؑ!

ردائے عفوِ قدیمی کا تحفۂ نادر
رکھ عطرِ خاصِ ابد میں بسا کے اے جبریلؑ!

ابھی قریبنے سے رضوان خود ہی رکھ جائے
شرابِ کوثر و تسنیم لا کے اے جبریلؑ!

شراب خانۂ فقر و غنا کے ساقی کو
رہوں گا آج تو خود ہی بلا کے اے جبریلؑ!

مرا سلام مرے عبدِ حر کو اب پہنچا
حضور میں اُسے خود احترام سے لے آ

اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مرے شعور و تخیل کے نقطۂ جاذب
مری حیات کے موجب ممات کے مقصود

رہی نہ تابِ نگہ میری شوخ چشمی کو
سمجھ میں آ گئی کیفیتِ غیاب و شہود

جسے سمجھ نہ سکا میں خودی کی دنیا میں
ترے شہود نے کھولا وہ رازِ لا موجود

تڑپ رہے جن کی منوّر رہی جبینِ نیاز وہی سجود تری نذر ہیں مرے معبود

رہا ہے ناز مجھے جس نیاز پر مولا
اُسے کرم کی نظر سے قبول کر مولا

باری تعالیٰ

خوش آمدید مرے مصطفےٰ کے شیدائی بڑا ہے میری مشیّت کو احترام ترا
خوش آمدید مرے مستِ بادۂ توحید! صبوحی جس کی تھی سبحان ربّی الاعلیٰ
خوش آمدید مرے رندِ سومناتِ شعور! زباں پہ جس کی رہا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خوش آمدید نوا سنجِ گلشنِ معنیٰ نہ دے سکی جسے دنیائے رنگ و بو دھوکا

ترے جنوں کو اگر جرأتِ تماشہ ہے
اُٹھا نگاہ - اِدھر دیکھ تو رہا کیا ہے

اقبال رحمۃ اللہ علیہ

وجودِ ذرّہ ہے خورشید کی تجلّی سے — نہیں نہ میری نظر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
سرورِ مہرِ جہاں تاب، جلوہ افشانی — نوائے مرغِ سحر، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
ترے حضور کا احساس دلفروز ہے دید — صدف ہے قلب، گہر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
ترے حضور میں اپنی جبیں اُٹھا کے رہے — نہیں مجالِ بشر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

"مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھو"

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء

غزل

اس لئے زیرِ فلک بے سبب آزار ہے حسن
جائے تو جائے کہاں عشق کی سرکار ہے حسن

بلبلِ سوختہ ساماں سے سنا ہے میں نے
عشق اک آتشِ بے شعلہ ہے گلزار ہے حسن

صاف آتا ہے نظر دیدۂ بینا کو یہی
عشق اقرارِ حقیقت ہے اور اظہار ہے حسن

جلوۂ شمع سے پروانوں کو ہوش آتا ہے
عشق کردار سہی جوہرِ کردار ہے حسن

عشق بے چارہ ہی آگاہ نہیں ہے ورنہ
روزِ میثاق سے خود اس کا طلبگار ہے حسن

صورتِ دائرۂ کون و مکاں ہے اِن سے
عشق نقطہ ہے اور اس نقطہ کی پرکار ہے حسن

چولی دامن کا ازل سے ہے ایسا ساتھ ان کا
حسن کا عشق ہے اور عشق کا معیار ہے حسن

۲۷ر نومبر ۱۹۳۵ء

عشق باقی

شیدا ہے گل کی بلبل خزاں تک — نالے کرے گی آخر کہاں تک؟
فریاد اس کی ہے باغباں تک — وہ بھی زمانی یہ بھی زمانی!

معشوق و عاشق دونوں ہی فانی!

شمع شبستاں گریاں سحر تک — اسکے پتنگے قرباں سحر تک
خاموش وہ اور یہ بیجاں سحر تک — وہ بھی زمانی یہ بھی زمانی

معشوق و عاشق دونوں ہی فانی!

لیلا و مجنوں فطرت کی لیلا[1] — مستی کے مظہر ہیر اور رانجھا
وامق نہ تھا یونہی شیدائے عذرا — وہ بھی زمانی یہ بھی زمانی

معشوق عاشق دونوں ہی فانی!

موجود ہوتے ہوئے بے نشاں ہو — ہر دل میں بستے ہوئے لامکاں ہو
پردوں میں رہتے ہوئے دستاں ہو — ایسا ہی معشوق ہے غیر فانی

اور اسکے عشاق ابدی جاودانی

۱۷ دسمبر ۱۹۳۶ء

[1] ہندی لفظ ہے بمعنی تماشہ

حسن

نقطۂ جاذبِ شعور ہے حسن　　نور ہی نور کا ظہور ہے حسن
شمع کا سوز و ساز کہتا ہے　　نار ہے عشق اور نور ہے حسن

۲

بانیِ نقشِ ہست و بود ہے حسن　　مانیِ مظہرِ شہود ہے حسن
جلوۂ شش جہات کی سوگند!　　ہو نہ ہو "جوہرِ نمود" ہے حسن

۳

پرتوِ "مہرِ لامکاں" ہے حسن　　ایک تنویرِ جاوداں ہے حسن
ہستیِ کائنات ہے اس سے　　رونقِ بزمِ انس و جاں ہے حسن

۴

ہو اگر جستجو تو عام ہے حسن　　سامنے دل کے صبح و شام ہے حسن
بوالہوس کی امیں بلا جانے　　اک حقیقت ہے جس کا نام ہے حسن

۲۴ر دسمبر ۱۹۳۶ء

معارف

بے خبر! نوعِ بشر بستۂ تقدیر نہیں
طوق گردن میں کوئی پاؤں میں زنجیر نہیں

سعی و کوشش سے ابھی ہو نہیں سکتا کیا کچھ
خود نزادل ہی مگر خوگرِ تدبیر نہیں

۲

بے خبر! نوعِ بشر بستۂ تقدیر نہیں
صاحبِ فکر و عمل! تو کوئی تصویر نہیں

کام تدبیر سے کمبخت ذرا لے کے تو دیکھ
وہم ہے تجھ کو کہ اکسیر بہ اکسیر نہیں

۳

بے خبر! نوعِ بشر بستۂ تقدیر نہیں
کوئی پیشانی پہ لکھی ہوئی تحریر نہیں

گرگیا آپ ہی جو اپنی نظر سے انساں
اس کی دنیا کے کسی گوشے میں توقیر نہیں

۴

بے خبر! نوعِ بشر بستۂ تقدیر نہیں
زندگی فرصتِ اعمال ہے تعزیر نہیں

زینتِ دوش ازل سے ہے نزادِ خودی
دشتِ ہستی میں تو صیاد ہے نخچیر نہیں

۲۷ دسمبر ۱۹۳۶ء

یقین

طلسمِ شاہد و شہود فروغِ حسن کی نمود سرِ نیاز کے سجود

یقین کا ظہور ہے ظہور ہے یقین کا

جمال کیا جمیل کیا۔ کلیم کیا خلیل کیا۔ بیان کیا دلیل کیا

یقین کا سرور ہے سرور ہے یقین کا

خیال کی تعلّیاں خیال کی تجلّیاں۔ تشفیاں تسلّیاں

یقین کا شعور ہیں شعور ہیں یقیں کا

یقیں مکان و لامکاں یقین روحِ انس و جاں یقیں حیاتِ جاوداں

یقیں مئے طہور ہے مئے طہور ہے یقیں

سمجھ کے رکھ دلِ حزیں یقیں نہیں تو کچھ نہیں کلیمؔ کا ہے قول امیں

یقیں شعاعِ طور ہے شعاعِ طور ہے یقیں

۲؍ جنوری ۱۹۳۹ء

معارف

مستِ صہبائے یقیں جبتک نہ ہو دل دل نہیں
شمعِ محفل ہو نہ جس محفل میں وہ محفل نہیں

ہیں مکاں کی زینتیں وابستۂ شانِ مکیں
جسمیں خود لیلیٰ نہ ہو لیلیٰ کا وہ محمل نہیں

۲

سوز سے محروم جو دل ہو وہ دیوانہ نہیں
مے سے جو خالی رہے وہ مے کا پیمانہ نہیں

دیکھکر جو اشکِ گرمِ شمع بے قابو نہ ہو
اک مگس وہ ہو تو ہو لاریب پروانہ نہیں

۳

جو نہیں آئینۂ صدق و صفا دل ہی وہ کیا
جسمیں عکس افگن نہ ہوں ارض و سما وہ دل ہی کیا!

روشناسِ حسن ہونے میں ہے شانِ آئینہ
عشق سے جسکو نہ ہو کچھ واسطہ وہ دل ہی کیا!

۴

بے یقیں بے سوز بے صدق و صفا دل دل نہیں
جسمیں لیلائے بقا بیٹھے یہ وہ محمل نہیں

بحرِ ہستی میں وہی موجِ رواں ہے سرفراز
ساحلِ افتادہ جسکی لے ایسی منزل نہیں

۳ جنوری ۱۹۳۹ء

نکات

گھبرائے سے مشکل کبھی آساں نہیں ہوتی
دل دل ہو تو رہتی نہیں مشکل کوئی مشکل

اس کون و مکاں میں ہے فقط دل کی حکومت
اے مردِ خدا! کیا ترے پہلو میں نہیں دل؟

۲

ہر کام کو احساس سے نسبت ہے اضافی
اور شدتِ احساس ہی کا نام ہے مشکل

جس شخص کا احساس نہیں عزم کے بس میں
ناکس ہے وہ اسکے لئے ہر کام ہے مشکل

۳

بے نار بھی گلزارِ براہیم ہے لیکن
پہلو میں کسی کے ہو براہیم کا دل بھی

تیری ہی طرح غنچے تھے سب پھول چمن کے
ویسی ہی تمنا ہے اگر دل میں تو کھل بھی

۴

آرام طلب دل ہے بہانوں کی پٹاری
ازبر ہیں جسے خود کو بچانے کے بہانے

ہوتے ہیں وہی بھاؤ بتانے میں ایں تاک
توفیقِ عمل دی ہی نہیں جنکو خدا نے

۱۴ر جنوری ۱۹۳۹ء

نکات

بلند و نکتہ رس و پاک بیں نظر ہے نظر
وہ کیا نظر جو خس و خار ہی کو دیکھ سکے؛

زباں پہ اُسکی "انا الحق" محال ہے آنا
جو بے بصر رسن و دار ہی کو دیکھ سکے

۲

جو رنگ و بوئے چمن میں الجھ کے رہ جائے
نگاہ اہلِ نظر کی وہ ہو نہیں سکتی

نمی سے ماند پڑے زنگ جسکو کھا جائے
چمک دمک رخِ زر کی وہ ہو نہیں سکتی

۳

دلِ غیور سلامت ہے جن کے پہلو میں
سرِ شک بن کے ٹپکتا نہیں لہو اُن کا

یہ درد درد بھی ہے درد کا علاج بھی ہے
خدا ہر ایک کو دے ذوقِ آرزو اُن کا

۴

پسند جس کو نہیں شیوۂ جفا طلبی
دلِ غیور نہیں وہ دلِ غیور نہیں

امیدِ نشاط کی صورت ہے سعیِ پیہم ہی
رکیں نہ پاؤں تو منزل کسی کی دور نہیں

۱۴ر جنوری ۱۹۳۹ء

انسان

فرشتے شوق سے لینے لگے ہیں نام ترا
اب اُنکی آنکھ سے اوجھل نہیں مقام ترا

تری نمود کی فطرت بھی ہو گئی قائل
تو ہی امام ہے کوئی نہیں امام ترا

غرورِ وسعتِ پہنائیِ "مکاں" ٹوٹا
بچھا ہوا نہیں کیا "لامکاں" میں دام ترا؟

شرابِ عشق ترستے ہیں جس کو آفاقی
اُسی سرورِ مجسّم سے پُر ہے جام ترا

مجال کس کی ہے اتنی کہ تیرے مُنہ آئے
بلا سکوت۔ قیامت ہے اِک کلام ترا

اِسی مقام کو کہتے ہیں "عبدہٗ" کا مقام
خدا حبیب ترا ماسوا غلام ترا

قسم ہے مجھ کو ابنِ حزیں کے وجداں کی
بنے گا بدر کبھی ماہِ ناتمام ترا

۱۷ر جنوری ۱۹۳۹ء

مومنؑ

حق گوئی و حق جوئی اوصاف ہیں مومن کے　　"اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی"
ملتی ہے توانائی قطرے کو سمندر سے　　مولا ہی کا ہو جانا ہے اسد اللٰہی

۲

خوش ہو کوئی ناخوش ہو اسکے لئے یکساں ہے　　محبوب ہے مومن کو مولا کی رضا جوئی
ایماں ہیں مومن کا ایقاں ہیں مومن کا　　حق کیشی و حق کوشی حق بینی و حق گوئی

۳

فریاد رسِ بیکس امداد دہِ بےبس　　ظالم کے مقابل میں شمشیرِ خدا مومن
اک شانِ جمالی ہے اِک شانِ جلالی ہے　　تدبیرِ خدا مومن تقدیرِ خدا مومن

۴

پیتا ہے پلاتا ہے جیتا ہے جلاتا ہے　　مومن میں نہیں رکھی پرویزی و چنگیزی
عالم کے لئے رحمت لاریب وجود اسکا　　اعجاز ہیں مومن کے اندازِ دل آویزی

۲۰ جنوری ۱۹۳۹ء

آتشِ شوق

آتشِ شوق فرشتوں کی تمنائے عزیز　　آتشِ شوق ہی نے خاک کو بخشی ہے تمیز
آتشِ شوق سے ہے جوہرِ ہستی کی نمود　　زندگی نام ہے جس کا ہے یہی چیز وہ چیز

۲

آتشِ شوق ہی واصل ہے گلزارِ خلیل　　آتشِ شوق کو دیتا ہے ہوا جبرائیل
آتشِ شوق کے قائل کی جزا جلوۂ طور　　آتشِ شوق کے منکر کی سزا موجۂ نیل

۳

آتشِ شوق سے ہے شمعِ شبستانِ حیات　　آتشِ شوق سے ہے تازہ دمِ ایمانِ حیات
فیض سے جسکے ہُوا کرتا ہے آدم مومن　　آتشِ شوق ہے وہ آیۂ قرآنِ حیات

۴

آتشِ شوق ہے بیتابیِ جوہر کی دلیل　　آتشِ شوق ہے تکمیلِ تمنا کی کفیل
آتشِ شوق سے خالی ہے ابھی جو دل بھی　　یاتو کمزور وہ بیچارہ ہے یا خوار و ذلیل

۲۳ جنوری ۱۹۳۹ء

لطفِ زیست

خروش و پنجۂ و دندانِ شیرِ نر کی قسم　　نگاہِ باز کی اور اُسکے بال و پر کی قسم
شہیدِ لذّتِ کردار کے جگر کی قسم　　بغیر "جرأتِ بیباک" لطفِ زیست نہیں

۲

فلک کی انجمنِ شب کے نور کی سوگند　　ضیائے شمس و قمر کے ظہور کی سوگند
درونِ سینہ کے سینا و طور کی سوگند　　بغیر "دیدۂ ادراک" لطفِ زیست نہیں

۳

قسم ہے اُس کی کہ ہے جسکا نام نجمِ سحر　　قسم ہے اس کی کہ نازک تریں[1] ہے جو گوہر
قسم ہے اُس کی جو ہے عندلیب[2] کا دلبر　　بغیر "دامنِ صد چاک" لطفِ زیست نہیں

۴

سرودِ نغمۂ جانسوزِ ساز کی سوگند　　جنونِ پختۂ جویائے راز کی سوگند
کسی کے ناز کی اپنے نیاز کی سوگند　　امیںؔ بغیر "دلِ پاک" لطفِ زیست نہیں

۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء

۱ شبنم سے مراد ہے　۲ گل سے مراد ہے۔

منزلِ شوق

منزلِ شوق میں کیا جانئے یہ کیا ہوتا ہے
دل وہی ہوتا ہے پر ایک بلا ہوتا ہے

آبلہ پائی سے ہوتے ہیں قدم اور بھی تیز
درد سے شوق بہ ہر حال سوا ہوتا ہے

ہفتخواں طے ہوئے جاتے ہیں اِدھر آپ سے آپ
بربطِ ذوق اُدھر گرمِ نوا ہوتا ہے

ایک دُھن ہے کہ یہ ہر کیف لئے جاتی ہے
یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کیا ہوتا ہے

سیلِ دریا ہے کہ رُکنا جسے آتا ہی نہیں
کوئی طوفان سا طوفان بپا ہوتا ہے

دشت ہو بحر ہو تاروں کی فضا ہو کچھ ہو
شوق خود منزلِ خضرِ راہ نما ہوتا ہے

منزلِ شوق کا ہر ذرّہ ہے تنویر سرشت
دن کو یہ مہر ابھی شب کو دیا ہوتا ہے

۲۶ جنوری ۱۹۳۶ء

سرفرازی

ہے سرفراز وہ ہمت بلند ہے جس کی — نگاہ پاک خودی ارجمند ہے جس کی
جو مہر و ماہ سے لیتا ہے کام پیالوں کا — زمیں سے تا بہ فلک اک زغند ہے جس کی

۲

وہ سرفراز ہے روشن شعور ہے جس کا — جو خود کلیمؑ ہے پہلو میں طور ہے جس کا
ازل سے جس کو لگاؤ ہے سعیِ پیہم سے — عمل کی شکل میں گویا ظہور ہے جس کا

۳

وہ سرفراز ہے جس کی زبان میں رس ہے — تخیلات میں رفعت بیان میں رس ہے
مئے یقیں سے ہے پُر جامِ آرزو جس کا — سرور روح میں ہے جسکی جان میں رس ہے

۴

وہ سرفراز ہے جرأت ہے جس کی شاہینی — بشرطِ آنکہ نہ ہو خود شکارِ لادینی
کفیلِ ذاتِ امیں ہے خودی کی خودداری — غرور ہو نہیں سکتی خودی کی خود بینی

۲۷ جنوری ١٩٣٩ء

افکار و حوادث

بہ تگ و دو پیٹ بھرنے کے لئے!
کچھ نہیں کیا اور کرنے کے لئے؛
بڑھ گئی ہے حد سے جینے کی ہوس
کون آمادہ ہے مرنے کے لئے؛

۲

ڈوبتے ہیں جو اُبھرنے کے لئے
ہے بہت کچھ انکے کرنے کیلئے
زندگی محبوب رکھتی ہے اُنہیں
جو بھی آمادہ ہوں مَرنے کیلئے

۳

شیر و شاہیں صید گیری کے لئے
کبک و آہو زود میری کے لئے
باغبانوں کے ہے باوا کا چمن
بلبل و طوطی اسیری کے لئے

۴

میر و والی عیش اڑانے کے لئے
اور دہقاں ہل چلانے کے لئے
کیا یہی تقدیرِ آدم ہے ایں
گھاس اُگتے بیل کھانے کے لئے

۳۰ جنوری ۱۹۳۹ء

معارف

خیالِ یار ہو اور دل کو پاسِ ہوش رہے!
کہ چشم چشم رہے اور گوش گوش رہے!

وہ رند پہلو میں جس کے ہو اپنا خمخانہ
بڑی ہی کیا ہے اسے کیوں وہ خم بدوش رہے!

۲

خیالِ یار ہو اور دل کو پاسِ ہوش رہے!
محال ہے کہ سکوں ہمرہِ خروش رہے

نمود جس کی مزا ہے ہر نمائش سے
اسی کے چاہنے والے گلیم پوش رہے

۳

خیالِ یار ہو اور دل کو پاسِ ہوش رہے!
یہ آئینہ ہے اُسی کی طرح خموش رہے

جھکے کچھ ایسے ہی اندازِ نو نیازی سے
اٹھیں نہ پھر سرِ آشفتہ بارِ دوش رہے

۱۸ فروری ۱۹۳۹ء

گل و شاعر

گل

گل کہاں ؟ میں جذبۂ بیباک ہوں
اک طلسمِ فطرتِ چالاک ہوں

قلبِ بیخِ سبز کا اک اضطراب
بن گیا ہے رنگ و بوئے لاجواب

کل ضمیرِ شاخ میں جو موج تھی
آج میں صورت ہوں اسکے اوج کی

قائلِ تقدیر کی سطحی نظر
پڑ رہی ہے میری شانِ حال پر

اس کو کیا معلوم میری مشکلات
تھی پسِ پردہ میری جہدِ حیات

میں رگِ گلبن میں دوڑا مثلِ برق
فتحِ بابِ زندگی کی دھن میں غرق

بن کے نوکِ خنجرِ ذوقِ نمود
کھولدی یوں میں نے ہر گرہِ وجود

آنکھ تھی ننھی سی گویا ہر شگاف
یا جنینِ "مادرِ امکاں" کی ناف

دو ہی دن میں آنکھ کونپل بن گئی　　　نور کے ساقی سے گاڑھی چھن گئی
نغمۂ بادِ صبا کا زیر و بم　　　ابر کی مے ریزیوں کا کیف و کم
ہو گیا اِذنِ جنوں میرے لئے　　　آنِ واحد میں ہوئے طے مرحلے
شاخ و برگ و خار اک تمہید تھی　　　باغ میں میرے ظہورِ حسن کی
آنکھ رکھتا ہے پسِ منظر کو دیکھ　　　یعنی سعیِ پیہم جوہر کو دیکھ

شاعر

رستمی بے ہفت خواں ملتی نہیں　　　پُرسکوں رہکر کلی کھلتی نہیں
اضطراب آئینۂ تقدیر ہے　　　اور "عمل" تقدیر کی تصویر ہے

پھول بنتا ہے اُلجھ کر خار میں
زندگی ہے اے امیں پیکار میں

۲۸ فروری ۱۹۳۹ء

وجدان

دیکھا ہے تصوّر میں اک مستِ تغافل کو — کونپل میں نظر آیا گلشن دلِ بلبل کو
اک پل میں پہنچتا ہوں میں عرشِ حقیقت تک[۱] — جب ایڑھ بناتا ہوں وجدان کے دُلدُل کو

۲

وجدان کی بینائی ملتی نہ اگر دل کو — ہوتا نہ کبھی حاصل "بینش" کا شرف گِل کو
ہے قعرِ یمِ دل میں۔ یا وسعتِ عالم میں — یہ قطرۂ یزدانی" چھوتا نہیں ساحل کو

۳

امکان کی دنیا میں یہ شعلۂ نورانی — فطرت کا کرشمہ ہے تائید ہے یزدانی
یہ جوہرِ آگاہی ہوتا نہ اگر دل میں — بڑھتی ہی چلی جاتی "پندار" کی نادانی

۴

وجدان کے شعلے سے دنیا میں اُجالا ہے — نامِ آدمِ خاکی کا اس نے ہی اُچھالا ہے
تصویرِ مکمل ہے وجدان کی رفعت کی — کہتے ہیں نبی جس کو وجداں کا ہمالہ ہے

۱؎ "تک" دانستہ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہم حقیقت کے قریب تو پہنچ سکتے ہیں لیکن اسکو کماحقہٗ پا نہیں سکتے

۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء

انسان کا شاندار مستقبل

زعمِ باطل میں گرفتار ہیں افلاک ابھی
چوکڑی بھولی نہیں فطرتِ چالاک ابھی

چاند سورج کی ذرا اور لڑھک لیں گیندیں
خیر سے بچہ تو ہے طفلکِ ادراک ابھی

گو وہ کثرت نہیں اوہام کی جو پہلے تھی
پاک ہونا ہے بتوں سے حرم پاک ابھی

دشتِ ہستی میں ہے جو شیرِ نرِ "کن فیکون"
منتظر ہے اسی نخچیر کا فتراک ابھی

ابرِ نیسانِ "تجسّس" کی ہے آمد آمد
جذبۂ شوق کا سیراب نہیں تاک ابھی

جھوٹ یہ بھی تو نہیں ہے کہ بلا ہے آدم
سچ ہے یہ بھی کہ عناصر ہیں غضبناک ابھی

کھول کر آنکھ ابھی اس نے کہاں دیکھا ہے؟
خواب آلودہ سا ہے دیدۂ ادراک ابھی

۲۰ مارچ ۱۹۳۹ء

معارف

زندگی ہے برق سا بیتاب ہو جانے کا نام
چشمِ انجم کی طرح بیخواب ہو جانے کا نام
شمع کے مانند بہرِ بزم جل جانے کا عشق
دن کا سورج رات کا مہتاب ہو جانے کا نام

۲

اضطرابِ پیہم موجِ یم ہستی ہے زیست
سرمدی پیمانۂ کیف و کمِ ہستی ہے زیست
مرتکب ہوتا ہے کفرِ شانِ مطرب کا وہی
جو سمجھتا ہے کہ اک "زیر و بمِ ہستی" ہے زیست

۳

اضطرابِ اندرونِ موج ہی ہے موجِ یم
روحِ مطرب کی تڑپ سے سازِ وقفِ زیر و بم
نکتۂ لولاک کو سمجھے نہیں ناداں ابھی
زیست جم ہے ماسوائے زیست واللہ جامِ جم

۴

زیست کے جوشِ عمل میں ہے توانائی کا راز
اور نمودِ دانۂ دل میں ہے پہنائی کا راز
سوز سے ہے زندگی اور زندگی کی رفعتیں
سوز کا منکر امیں کیا جانے بالائی کا راز

؎ مشہور حدیث لولاک لما خلقت الافلاک (اگر تجھ کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا

۲۳ مارچ ۱۹۳۹ء

نکات

رو شناسِ غم تو کر پامالِ غم ہونے نہ دے
چوٹ آتی ہے تو آئے دل کو خم ہونے نہ دے
ہے اسی کی تاب سے سرسبز تاکِ زندگی
اضطرابِ برقِ بیتابی کو کم ہونے نہ دے

۲

آنکھ میں نم ہو مگر اشکوں سے تر دامن نہ ہو
ماتمِ صد آرزو دل ہو مگر مدفن نہ ہو
نوجوانانِ وطن، تم سے ہے اتنی التجا
رونقِ محفل تو ہو لیکن خدارا زن نہ ہو

۳

ٹھوکریں کھا کر قدم ہوتے ہوں جنکے تیز تر
اور ستانے میں بھی جن کی ہو منزل پر نظر
جیت رہتی ہے انہیں کی زندگی کی دوڑ میں
ذکر رہتا ہے فرشتوں میں انہیں کا عرش پر

۴

امتزاجِ رنج و راحت سے ہے دنیا کا خمیر
زندگی آزاد بھی کچھ کچھ ہے اور کچھ کچھ اسیر
ہے تضادِ زندگی ہی زندگی کا "سحرِ حسن"
آشنا ہیں اس حقیقت سے امیں روشن ضمیر

۲۴ مارچ ۱۹۳۶ء

تازہ کاری

آرزوئے "تازہ کاری" سے نہ دل خالی رہے
کونپلوں، غنچوں، گلوں سے لد کے ہر ڈالی رہے

یا خزاں کا دور ہے یا باغ ہے اجڑا ہوا
کام کے ہوتے ہوئے بیکار کیوں مالی رہے

۲

آرزوئے تازہ کاری ہے شرابِ زندگی
اور اسی جوہر کی بیتابی ہے تابِ زندگی

آرزوئے تازہ کاری ذوقِ بے معنی نہیں
ہے اسی پر انحصارِ انتخابِ زندگی

۳

آرزوئے تازہ کاری سے فلک پیما ہے زیست
اور اسی سیلاب سے اُمڈا ہوا دریا ہے زیست

زندگی کے "جوہرِ باقی" کی ہے اس سے نمود
تازہ کاری کی کٹھالی میں ابھی سونا ہے زیست

۴

آرزوئے تازہ کاری سے ہے آدم کی نمود
کانپ کر فطرت اسی جوہر کو کرتی ہے سجود

ہے رہینِ تازہ کاری آبرو افراد کی
اور اسی پر منحصر اقوام کی بود و نبود

۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء

زکات

بجلیاں بھر لی ہوں جس نے شوق کی پرواز میں — رونما ہوتی ہے رفعت اسکے ہی انداز میں
بیج کے نقطہ کے اندر ہے شجر سمٹا ہوا — منعکس انجام ہے آئینۂ آغاز میں

٢

چکنے چکنے پات ہیں بروا اگر ہے ہونہار — شاخ جو سوکھی نہیں ہوگی بہار اسپر نثار
قدر کر اس کی یہی آئینۂ "تقدیر" ہے — "آج" جو نبرا ہے تیرے "کل" کا ہے آئینہ دار

٣

آرزوئے "تازہ کاری" سے ہے دل کی زندگی — تازہ کاری ہی سے ہے ساری آب و گل کی زندگی
نونہالانِ چمن وہ، اور یہ دیوارِ چمن — زندگی کس کی ہے؟ بوٹوں کی کہ سِل کی زندگی

٤

جوہرِ بینا کو بیتاب تر رکھتا ہے زیست — دیدۂ ادراک کو بیخواب تر رکھتا ہے زیست
دل کے گلشن کی "خزاں ناآشنائی" ہے حیات — اس چمن کو اے امیںؔ! شاداب تر رکھتا ہے زیست

٢٠ر اپریل ١٩٣٩ء

حقائق

نجانے ان بتوں کی کیا ہوئی وہ شانِ محبوبی
متاعِ دلبری تھی انکے ہاں واللہ یہی خوبی

بڑھی جاتی ہے جس نسبت سے انکی نخوتِ بیجا
اُسی نسبت سے بڑھتی جا رہی ہے میری مجذوبی

۲

کہاں وہ چشمِ مستِ حسن کی پیمانہ برداری؛
کہاں یہ اپنے ہی رندوں سے بے باکانہ بیزاری؛

کہاں لطفِ نشاط انگیزِ ساقی میگساروں پر!
گدائی سے بتر ہے آجکل کا شغلِ میخواری

۳

یہ میخانہ بھی ہے تو بھی ہے پہلو میں اگر دل ہے
اسی کے سوزِ بزم افروز سے تو شمعِ محفل ہے

ترے پیمانۂ پہلو پہ بھی لکھا ہے یہ مصرع
خودی ہو جسکی قیمت میں نہیں وہ زہرِ قاتل ہے

۴

خودی کو بیچکر پینا ہے اپنا ہی لہو پینا
کسی کے بل پہ جینا اے امیں کس کام کا جینا؛

اُسی شعلے کا میں قائل ہوں جو ہو اپنے سینے میں
کلیم اللہ کریں جا کر طوافِ شعلۂ سینا

۲۳ اپریل ۱۹۳۹ء

"وداع"

رخصت ہندوکش کے پہاڑو! رخصت اے دلچسپ اجاڑو!
رخصت ننگا[1] کے نظارے قدرت کے نادر شہ پارے
رخصت اے ذی شان دُمانی[2] منظر جس کا ہے لاثانی!
رخصت اے برفانی تالو[3] رخصت دودھ کے ندی نالو!
تم تھے میرے طور اور سینا میں حق کے جلووں کا جویا
قلب و نظر بیدار ہوئے ہیں جلووں سے سرشار ہوئے ہیں
شوق مرا پائندہ نکلا جو شندہ پابندہ نکلا
جنگ چھڑی ہے خیر اور شر کی آفت میں ہے جان بشر کی

ع۱ ننگا۔ پربت۔ سطح سمندر سے ۲۶۶۲۰ فٹ بلند پہاڑ جس پر ابھی تک المانوی (اہلِ جرمنی) چڑھ نہیں سکے۔ اس کا دوسرا نام دیامیر Diamia ہے
ع۲ دومانی Domani یا رکھاپوشی Rakhaposhi سطح سمندر سے ۵۵۵۰ فٹ بلند پہاڑ جس پر ابھی تک کوئی انسان چڑھ نہیں سکا۔ ع۳ تال تالاب یا جھیل

"مایا" اور "برہما" کا جھگڑا — "من کی آنکھوں میں ہے دنیا

"مایا" راون اور "من" سیتا — رام ہے "برہما" "سرجن[1] ہارا

وہ سیتا ہے رام کی رانی — راون کی جس نے نہ مانی

بخت مرے بیدار ہوئے ہیں — آئینہ اسرار ہوئے ہیں

مٹی کی معراج یہی ہے — اس کا تخت اور تاج یہی ہے

بیس[2] اور تیرہ[3] سال کا محرم — جاتا ہے با دیدۂ پرنم

وادی کے باشندو! رخصت! — سرکاری کارندو رخصت!

رخصت تم سے شاد رہو تم
شاد رہو آباد رہو تم

۲۵ اپریل ۱۹۳۹ء

۱؎ سرجن ہارا۔ خالق

طیّارہ

۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء کی ایک سہانی صبح کو مجھے ایک ہوائی جہاز میں ۲۲ منٹ تک اُڑنے کا اتفاق ہوا اس نظم میں میں نے اپنے اس وقت کے مشاہدات اور محسوسات کو قلمبند کیا ہے ٭

غَرْغَرْ غَرْغَرْ غَرْغَرْ غَرْغَرْ — طیّارے کا گھوما چکّر
گردش کیسی تیز ہوتی ہے! — دُلدُل کو مہمیز ہوئی ہے
وہ پہیوں میں حرکت آئی — چھُٹتی ہے پر دار ہوائی
دُم کو اُٹھا کر فرفر بھاگا — تیز ہوا اک دم سے اُٹھا
اُڑن کھٹولا ہے طیّارہ — تختِ سلیماں کا نظّارہ
مچھلی تیر رہی ہے جل میں — جان ہے جس کی چلتی کل میں
بھوت اڑا جاتا ہے ہوا میں — گونج سی اک پیدا ہے فضا میں
پنچھی جس کو سن کر سہمے — بیٹھ رہے ہیں دبکے دبکے
باز عقاب اور چیلیں کوّے — مان گئے ہیں ہار بچارے

آگے پیچھے کوئی نہیں ہے — اوپر نیچے کوئی نہیں ہے
دل کش ہے وادی کا نظّارہ — سندر سندر پیارا پیارا
وہ دریا وہ کھیت وہ بنگلے — سبزے میں چوپائے چرتے
مانس بھی ہیں ٹھگنے ٹھگنے — نقشے پر جیسے ہوں نقطے
پتلے ناچ رہے ہیں گویا — جن کا "من" ہے غافل سویا
"مایا" کے پھندوں میں جکڑے — دنیا کے دھندوں میں جکڑے
رفعت کیا ہے؛ ان کو خبر کیا؛ — ہوتے ہیں یہ قلب و نظر کیا؛
کیچڑ کا کیڑا کیا جانے؛ — دیوانے ہیں کیوں پروانے؛
رفعت کی کیوں روح کو دھن ہے؛ — کیوں پرواز کا انہیں گن ہے؛
پستی سے ہے کیوں گھبراتی؛ — کیوں رفعت ہے اسکو بھاتی؛

رفعت پریم ہے پریم ہے رفعت
پستی ہے مایا کی الفت

یکم مئی ۱۹۳۹ء

رازِ کائنات

بیتابیٔ نظر کو تلاشِ سکوں نہیں
اس جذبۂ عمل کا محرک جنوں نہیں

اک جوہرِ لطیف ہے میری نگاہ میں
میں جس کی تاک میں ہوں وہ صیدِ زبوں نہیں

۲

چونکا دیا ہے دل کو حقیقت نے خواب سے
ہر چیز کائنات کی ہے اضطراب سے

ذرّے نے جو کہی نگہِ جستجو سے بات
بالکل وہی جواب ملا آفتاب سے

۳

یا اصل میں ہیں ایک حیات اور موجِ برق
یا پھر ہے زیست گلشنِ ہستی میں زوجِ[1] برق

قانونِ ارتقا پہ مگر جن کو ہے عبور
انکی نگاہ میں ہے یہی زیست اوجِ برق

۴

ممنونِ اضطراب ہے اعجاز و ساحری
اس کے بغیر ہیں نہ نبوت نہ شاعری

ہے رازِ کائنات یہی قصۂ مختصر
بیتابیوں سے خاک میں آئی ہے آمری[2]"

۳ رمئی ۱۹۳۹ء

[1] زوج بمعنی جوڑا [2] آمری تحکم

عرضِ حال

جنوں سامانیاں میری نہ لاسکتی تھیں رنگ ابتک

مرا مسکن رہا تھا گوشۂ تاریک و تنگ ابتک

ازل سے جس کی قسمت میں لکھا تھا بے خطا ہونا

نکالا ہی نہ تھا ترکش سے میں نے وہ خدنگ ابتک

نظر کے دُوربیں ہونے پہ تھا مجھ کو یقیں لیکن

نہ اترا تھا مرے پہلو کے آئینے سے زنگ ابتک

فضائے کہکشاں اک عمر سے تھی منتظر جس کی

اسیرِ خاک تھی میری وہ شاہینی امنگ اب تک

میں اپنی ذات ہی سے آجتک دست و گریباں تھا

مرے اپنے ہی گھر میں برملا جاری تھی جنگ اب تک

تعجّب ہے ندیمِ قیس ہو کر کھا گیا دھوکا
رہے تھے مانعِ دیوانگی کیوں نام و ننگ اب تک
اُسے پھرنا تھا جسکو "لامکاں" کے کونے کونے میں
بندھے تھے کیوں گرہ میں اسکی خاک و خشت و سنگ اب تک

۱۱ مئی ۱۹۳۶ء

شکوۂ شیطان

جبرئیل

زمین کی سمت سے الٰہی دھواں سا کیوں آج اُٹھ رہا ہے
وہاں قیامت نہ آگئی ہو کہ شور اتنا مچا ہوا ہے
جہنّمی نیر یعنی شعلے بڑھے چلے آرہے ہیں کیسے؛
یہ سائیں سائیں ہے انکی یا کوئی بے بسی میں کراہتا ہے؛
کبھی نہ دیکھا تھا میری آنکھوں نے اس بلا کا مہیب منظر
فرشتے گھبرا گئے ہیں یارب! تو ہی بتا کیا یہ ماجرا ہے؛
ملائکہ دم بخود ہیں دہشت دلوں پہ کچھ ایسی چھا رہی ہے
مگر ہے اک تیری ذات ہی" لامکاں" میں جو مسکرا رہی ہے

۲

باری تعالےٰ

زمین کی سمت سب کی ایک چشمک نے کھیل جس کا بگاڑ ڈالا
یہی وہ پاگل ہے روزِ اوّل پڑا تھا جبرّیل جس سے پالا
یہی وہ گمراہ ابلیس ہے کبھی فرشتوں کا جو تھا رہبر
یہی وہ ناری ہے جس کا باطن کدورتوں نے کیا ہے کالا
یہی وہ گستاخ کینہ ور ہے "بدی کا موجد" ہے نام جس کا
یہی ہے جس نے کہا تھا "جنّت کو مَیں لگا کر رہوں گا تالا"
شہابِ ثاقب کی زد سے باہر ٹھہر گیا ہے بڑھا نہیں ہے
ابھی بتائے گا خود ہی ہم کو کہ کیوں یہ افسردہ و غمیں ہے

۳

شیطان

قدیم و قیوم و حیّ و احکم مرے گناہوں کا کیا ٹھکانہ!
وہ تیرا آدم ہے جرم کر کے تراش لیتا ہے جو بہانہ
گناہ ہی جس کی زندگی ہو اور اس پہ ہو وہ "گناہ گر" بھی
پڑی ہی کیا ہے اُسے کہ تنتا پھرے وہ توبہ کا تانہ بانہ
کیا ہو جب کوئی جرم دانستہ میری غیرت یہی کہے گی
کہ عذرِ تقصیر و وردِ توبہ ہے ایک فعلِ منافقانہ

نہ توبہ کرنے کو آ گیا ہوں نہ میرا مقصد ہے عذر خواہی
مجھے ہے اک التماس کرنا عطا اجازت ہو یا الٰہی!

۴

شیطان اجازت مل چکنے کے بعد

جو اپنے ذمہ لیا تھا میں نے وہ کام انجام پا چکا ہے
ترا "خلیفہ" تجھے ہی پروردگار دل سے بھلا چکا ہے
مرا تو کیا ذکر خود تری ذاتِ پاک ہی کا ہوا ہے منکر
جسے تو کہتا ہے اپنا بندہ وہ ہاتھ سے تیرے جا چکا ہے
شجر وہ جس پر تھا ناز تجھکو کہ عرش سا ہونگی اس کی شاخیں
"انانیت" کا مہیب کرم اسکے ریشے ریشے کو کھا چکا ہے
یہ تیرے خاکی الٰہی توبہ! غضب کے بے باک ہو گئے ہیں
جو میرا فن تھا یہ اس میں مجھ سے بھی بڑھ کے چالاک ہو گئے ہیں

۵

شیطان کلام کو جاری رکھتے ہوئے

حیا کو بیہودگی سمجھنا فریب کاری پہ ناز کرنا!
غریب و بیکس پہ ظلم ڈھانا امیر سے ساز باز کرنا!
یہ ننگِ انسانیت درندے رہے نہیں درگذر کے قابل
تجھے ترے قہر کی قسم ہے نہ ان کی رسّی دراز کرنا
نہ جانتے ہوں جو یہ بھی یارب! حلال کیا ہے حرام کیا ہے؟
کہونگا بس تو یہی کہ ایسوں سے چاہیئے احتراز کرنا
قریب ہی ہو اگر قیامت تو خیر کچھ دن گذار لونگا
قیاس میرا اگر غلط ہو تو خاکیوں میں نہ اب رہونگا

۶

باری تعالےٰ

جہاں ہو جذبات کی دنابت وہاں تعلّی ضرور ہو گی
اور ان پہ ہو انحصار جس کا وہ زندگی پرفتور ہو گی

تضاد دنیا کا ہے کرشمہ کبھی اندھیرا کبھی اجالا
شہیدِ ظلمت ہے آج اگر کل یہی پرستارِ نور ہو گی

برس کے اُڑ جائیں گی گھٹائیں ظہورِ مہرِ منیر ہو گا
کلیم کوئی نہ کوئی آئے گا خاک یہ پھر سے طور ہو گی

ابھی قیامت کہاں عزازیل؛ جا وہیں ہے جہاں سے آیا
بگڑنے والا ہے کوئی دم میں یہ کھیل تیرا بنا بنایا

۲۴ رمئی ۱۹۳۹ء

معارف

وہ خلدِ گوش تو ہیں جنت نگاہ نہیں
قصور میرا ہے اُن کا کوئی گناہ نہیں
وہ "لامکاں" میں "زمان و مکاں" میں ہیں ساکن
سحر کے نور کے لائق شبِ سیاہ نہیں

۲

مری سمجھ میں یہ اب جا کے بات آئی ہے
حجاب میری نگاہوں کی نارسائی ہے
اُٹھے "زمان و مکاں" کی نہ جب تلک چلمن
مرے نصیبوں میں محبوب کی جدائی ہے

۳

"شنید" "دید" کی سیڑھی ہے دید بامِ جمال
شنید دعوتِ ساقی ہے دید جامِ جمال
وہی ہمائے سعادت ہے جسکی نظروں میں
شنید صورتِ دانہ ہے دید دامِ جمال

۴

شنید دشت نوردی ہے دید عیشِ ورود
شنید و دید ہیں گویا امینِ غیاب و شہود
پتے کی بات کہی ہے چمن کے محرم نے
شنید بادِ بہاری ہے دید گل کی نمود

۲۷ مئی ۱۹۳۹ء

غزل

ٹھہر گیا ہوں ذرا سی ذرا نوا کیلئے
چمن میں ذکرِ نشیمن نہ کر خدا کیلئے!

خموش رہ نہیں سکتا فضائے گلشن میں
زباں ملی ہو جسے عرضِ مدّعا کیلئے

تلاش ہے مرے نالوں کو تفتہ جانوں کی
یہ تحفہ گل کے لئے ہے نہ ہے صبا کیلئے

رگِ تلاش میں جسکی ہو موجِ برقِ خلوص
وہ ابتدا سے تڑپتا ہے انتہا کیلئے

کھدا ہے تیغِ خودی پہ ازل سے یہ مصرع
"ہیں ماسوا کی صفیں تیغ آزما کیلئے"

وہ خاک خاک ہی رہتی ہے حشر تک نادان!
خلوصِ دل سے جو کوشاں نہ ہو بقا کیلئے

یہی تو کام کی اک چیز دی گئی تھی تجھے
امیںؔ دراز نہ کر ہاتھ التجا کے لئے

۳۱ مئی ۱۹۳۹ء

نکات

ٹالے ٹالے یہ وقت ٹالے　　سختی ہی کے دن سہی نکالے
لے ضبط سے کام دل سے کہدو　　ہے غصہ حرام تھوک ڈالے

۲

سینے سے نکل چلے ہیں نالے　　ہاں غیرتِ دل! اگلا و بالے
آنسو ہی تو جانِ آبرو ہیں　　پی کر انہیں آبرو بچالے

۳

بلبل نے کئے ہزار نالے　　کیا روئے چمن میں ہنسنے والے؟
ہو جاتے ہیں کیا سے کیا کہوں کیا　　نالوں کو اگر کوئی دبالے

۴

ہیں سوز دروں سے دل کے لالے　　اس آگ کو رکھ ابھی سنبھالے
پک جائیگا منہ گر آہ نکلی　　لالے لالے ہیں اور چھالے چھالے

۴ / جون ۱۹۳۹ء

تجلّیات

بیتاب نگاہوں کا مقصود ہی پردے میں
الجھن سی یہ الجھن ہے مشہود ہے پردے میں

آنکھوں کے پسِ پردہ ہے عکس فگن لیکن
ظاہر کی یہ صورت ہے موجود ہے پردے میں

۲

ایمان کی دنیا ہے ایقان کی دنیا ہے
مہجور کی دنیا بھی کس شان کی دنیا ہے

معمول یہاں کا ہے بیتابی و بے خوابی
یہ جان کی دنیا ہے پہچان کی دنیا ہے

۳

بے شوقِ جنوں ساماں رفتار نہیں ممکن
بے جوہرِ بے تابی کردار نہیں ممکن

قندیل کی "خودسوزی" کیا کہتی ہے سنتے ہو؟
"دل خود نہ جلے جبتک دیدار نہیں ممکن"

۴

ہے باعثِ بیتابی پردے کا نہ ہٹنا ہی
بجلی کی تڑپ کیا ہے، بادل کا نہ پھٹنا ہی

سچ کہتی ہے محفل سے قندیلِ سرِ محفل
"اس سوزِ رگِ جاں کا بہتر ہے نہ گھٹنا ہی"

۹ رجون ۱۹۳۹ء

تجلّیات

حسن اور عشق کی یکجائی ہے عنوانِ حیات　　اصل میں ایک ہی یہ بیت ہے دیوانِ حیات
عشق اور حسن کی برکت سے ہے نیرنگِ وجود　　دم سے ان دونوں کے آباد ہے ایوانِ حیات

۲

ذوقِ معنی ہو اگر حسن بھی ہے عشق بھی ہے　　دانۂ دل کا ثمر حسن بھی ہے عشق بھی ہے
تو ہی آگاہ نہیں ذات سے اپنی ورنہ　　جوہرِ جانِ بشر حسن بھی ہے عشق بھی ہے

۳

جوہرِ کیفیت ہے حسن اور رگِ تاک ہے عشق　　پرتوِ مہرِ ازل حسن ہے ادراک ہے عشق
ہو گیا آئنہ آئینۂ حیرت سے یہ راز　　حسن خود عینِ لطافت ہے جبھی پاک ہے عشق

۴

حسن اور عشق سے ہے گرمیٔ بازارِ وجود　　نقدِ سجدہ ہے اُدھر اور اِدھر جنسِ نمود
وا اگر چشمِ یقیں ہو تو مزا آتا ہے　　گو تخیّل ہی تخیّل ہے ابھی غیب و شہود

۲۱ / جون ۱۹۳۹ء

زکات

پیمانۂ آرزو کو بھر لے	کرنے کے جو کام ہیں وہ کر لے
کیا تجھ سے امیدِ سخت کوشی؟	ذمّہ ہی نہ کوئی تو اگر لے

۲

پیکارِ حیات سے نہ ڈرئیے	مت روئیے سسکیاں نہ بھرئیے
جینا ہے تو جی نہ ہاریئے گا	مرنا ہے تو مردِ بن کے مرئیے

۳

چھینو چھینو بزور اس سے	مانگا تو ملیں کے تم کو دھکے
دنیا وا اُسی ہے منچلوں کی	جکڑو اس کو ذرا جو اکڑے

۴

مے نوش یہاں ہیں ظرف والے	گورے ہوں کہ زرد ہوں کہ کالے
بیظرف جہاں کے میکدہ سے	جانے ہیں جنابِ من نکالے

۲۲ جون ۱۹۳۹ء

۱۲ لونڈی

تجلّیات

نالۂ بلبلِ شیدا ہو کہ ہو خندۂ گل	ایک ہی حرفِ محبّت کی ہیں تفسیریں دو
عشق اور حسن کا مضموں ہے بباطن واحد	گرچہ ظاہر میں نظر آتی ہیں تحریریں دو

۲

ایک ہی سوز کے مرہون ہیں پروانہ و شمع	شعلۂ طور ہے دل گرمیِ موسیٰ کے لئے
حسن مستور جھلک اپنی دکھا دیتا ہے	دل اگر وقف ہو جلووں کی تمنا کے لئے

۳

بحر اُڑ اُڑ کے سوئے دشت و جبل جاتا ہے	اور پھر آتا ہے بہ بہ کے بشکل دریا
ہجر کہتے ہیں جسے وصل کی شبرینی ہے	خشک ہو حلق تو پھر دیکھئے پانی کا مزا

۴

ہجر میں چاند کے مانند ہے روشن رخِ ہجر	ماند پڑتا ہے مگر حسن کے سورج کے حضور
حسن کی شانِ دلآویزی ہے مستوری میں	عشق پرور ہے ایں بادۂ فرقت کا سرور

۲۴ر جون ۱۹۳۹ء

حسن و عشق

عشق

درد ٹڑپائے اور دوا نہ ملے — بے بسی ہو اور آسرا نہ ملے

مدّعی ہو کے مدّعا نہ ملے — عشق! اے عشق مرحبا تجھ کو!

اور بھی دے جگر خدا تجھ کو!

بے قراری قرار کی صورت — زندگی انتظار کی صورت

داغِ دل لالہ زار کی صورت — عشق! اے عشق مرحبا تجھ کو!

اور بھی دے ہنر خدا تجھ کو!

ذرّے ذرّے میں طور کے ساماں — پتّے پتّے میں بے نشاں پنہاں

تو ہے اور دیدِ جلوۂ جاناں — عشق! اے عشق مرحبا تجھ کو!

اور بھی دے نظر خدا تجھ کو!

روح بیدار آہ و زاری سے — سینہ گلزار لالہ کاری سے

دُرفشاں آنکھ اشکباری سے — عشق! اے عشق مرحبا تجھ کو

اور بھی دے گہر خدا تجھ کو!

حسن

دل کی رفعت ترے خیال سے ہے　　آئنہ یہ ترے جمال سے ہے
عشق زندہ ہی عرضِ حال سے ہے　　گو ازل ہی سے بے نیاز ہے تو

حسن! اے حسن دلنواز ہے تو!

روبہ کعبہ نماز کی صورت　　دستِ مطرب میں ساز کی صورت
عشقِ مطلق نماز کی صورت　　کارفرما ہے کارساز ہے تو

حسن! اے حسن دلنواز ہے تو!

بقعۂ نور چار سو تجھ سے　　باغِ عالم کا رنگ و بو تجھ سے
عشق ہے وقفِ آرزو تجھ سے　　عقل کہتی پھرے کہ راز ہے تو

حسن! اے حسن دلنواز ہے تو!

راز کوئی نہ یہ معمّا ہے　　جس حقیقت کا نام دنیا ہے۔
حسن اور عشق کا تماشہ ہے　　گو ابھی بے نیاز ساز ہے حسن

دل نگر نے ہے نے نواز ہے حسن

۲۸؍ جون ۱۹۳۶ء

عشق

تارِ شیرازۂ شعور ہے عشق
سوزِ پنہانِ دل کا طور ہے عشق
جلوۂ جانِ آرزو کی خلش
بادۂ شوق کا سرور ہے عشق

۲

جوہرِ ذوق کا ظہور ہے عشق
برقِ بیتابِ جاں کا نور ہے عشق
آتشِ اشتیاق کا شعلہ
شیوۂ جانِ ناصبور ہے عشق

۳

میں نہیں جانتا کہ کیا ہے عشق!
درد یا درد کی دوا ہے عشق!
دل کو محسوس ہو رہا ہے مگر
رہنمائے رہِ بقا ہے عشق!

۴

سربسر نفیِ ماسوا ہے عشق
حسن "اِلّا" ہے اور "لا" ہے عشق
یوں نظر آ رہا ہے مجھ کو امیںؔ
حسن "داتا"[1] ہے اور "دیا"[2] ہے عشق

۳۰ جون ۱۹۳۹ء

[1] ہندی الفاظ ہیں۔ داتا یعنی دینے والا اور "دیا" یعنی کرم یا مہربانی

احوال و مقامات

۱

ہو غرقِ یمِ نورِ دل کا سفینہ۔ کبھی آئینہ اور کبھی چشمِ بینا۔ کبھی دستِ بیضا کبھی طورِ سینا

یہی ہے مقام "حریمِ حضوری"

خودی کی بلندی وہ معراجِ دل کی غنی ہے نظر جس سے محتاج دل کی غرض ہاتھ میں جس کے ہے لاج دل کی

حقیقت میں ہے جادۂ ناصبوری

وفورِ محبت سے مجبور رہنا۔ مئے شوق سے مست و مسرور رہنا۔ انا الحق سرا مثلِ منصور رہنا

ہے عشاق کی "منزلِ بےقصوری"

۲

سنبھلنا ہے دل اپنا دُکھڑا سنا کر۔ کلی دل کی کھلتی ہے جب مسکرا کر۔ نگاہیں جب اٹھتی ہیں آنسو بہا کر

مقامِ "قبول و اجابت" یہی ہے

کفِ خاک بیباک ہو دیدہ ور ہو۔ خود آگاہ ہو خودگر و خود نگر ہو۔ زمیں پہ قدم آسماں پر نظر ہو
کہ لاریب منشائے فطرت یہی ہے

یہی خاکیوں کی ہے معراجِ عرفاں اسی سے حقیقت میں ہے شانِ انساں امیں خدمتِ خلق ہی اصلِ ایماں
قسم ہے خدا کی شریعت یہی ہے

۲ر جولائی ۱۹۳۹ء

نگہ اپنی

تری نگاہ میں ہستی ہے بزمِ عیش و سرور
مری نظر میں یہ پیکارِ جاودانی ہے

ترا خیال اسیرِ حیاتِ کون و مکاں
مرے دماغ کی پرواز "لامکانی" ہے

۲

تری نگاہ میں دُنیائے رنگ و بُو کی جھلک
گذر چکا ہوں میں اس منزلِ نمائش سے

ترے عمل کی جزا واہ واہِ ہنگامی
مرے خلوص کو نفرت سی ہو ستائش سے

۳

مثالِ موش زمیں دوز زندگی تیری
فضائے نور کا دستور شاہباز سے پوچھ

حیات کہتے ہیں کس کو تری بلا جانے
یہ بات جا کے کسی مردِ بے نیاز سے پوچھ

۴

تری نگاہ اگر خود نگر نہیں ناداں!
چراغِ راہگذر ہے چراغِ خانہ نہیں

امیں ہے شانِ خودی خودگری و خودنگری
خودی جو پرتوِ ماحول ہو یگانہ نہیں

۹؍ اگست ۱۹۳۹ء

نکات

۱

کس وہم میں الجھا ہے کہ تقدیر میں کیا ہے؟ لکھا ہوا تقدیر کا اچھا کہ بُرا ہے؟
تقدیر کا قائل ہے تو اے بندۂ تقدیر! تیرے لئے بس مسلکِ تسلیم و رضا ہے

۲

امروز اگر تیرا ہے آئینۂ فردا اے مردِ خدا! کیوں اسے صیقل نہیں کرتا؟
صیقل سے اُبھر آئینگے جو نقش ہیں دھندلے کھنچ جائیگا بیساختہ تقدیر کا نقشہ

۳

جب مو قلم ادراک کا فطرت سے ملا ہو تخئیل کا صندوقچہ رنگوں سے بھرا ہو
جب فکرِ رسا میں نہ ہو خاکوں کی کمی کچھ نقاش ہی خود کس لئے تصویر بنا ہو؟

۴

وجدان کی مضراب بھی ہے بربطِ دل بھی دانہ بھی ہے اور باغ کی نمناک ہے گِل بھی
محفوظ ہیں تیرے ہی لئے اسکے خزانے دل کھول کے فطرت سے ائیں تو کبھی مِل بھی

۱۰ اگست ۱۹۳۶ء

غزل

جوہرِ پاک ترا خاک میں گر خاک نہ ہو
تا ابد لب پہ ترے شکوۂ افلاک نہ ہو

آبرو ریزِ خودی ہو نہ اگر تو خود ہی
عمر بھر آنکھ تری اشک سے نمناک نہ ہو

ہے تری سوختہ سامانی ہی سے اس کا وجود
شعلہ رہتا ہے کہاں جب خس و خاشاک نہ ہو

عزمِ تسخیر کے جذبات ہوں آنکھوں میں اگر
منحرف تجھ سے کبھی فطرتِ چالاک نہ ہو

رشکِ جنت ہو کہاں جوہرِ دانہ کی نمود
ہاتھ سے اپنے اگر اُس کا جگر چاک نہ ہو

اس حقیقت کو خدارا نظر انداز نہ کر
سرد ہو جاتا ہے وہ شعلہ جو بیباک نہ ہو

غیر ممکن ہے امیں حل ہو معمائے حیات
دل اگر پاک نہ ہو دیدۂ درّاک نہ ہو

۱۸ راگست ۱۹۳۹ء

تجلّیات

غریقِ قلزمِ نظّارہ ہے نگاہ مری
لبوں پہ بن کے تبسّم رُکی ہے آہ مری

اگرچہ نغمۂ خاموش ہے سکوت آموز
مگر کہاں ہے مرے بس میں واہ واہ مری

۲

پڑی ہے جب سے خورِ حسن پر نگاہ مری
تبسّمِ گلِ تر بن گئی ہے آہ مری

زبانِ اہلِ چمن میں بھی ہے بوئے لطیف
نکل رہی ہے جو سینے سے واہ واہ مری

۳

وفورِ شوق کا آئینہ ہے نگاہ مری
اور اس کا جوہرِ بیتاب واہ واہ مری

نظر نواز ہے جس کی تلاش تھی دل کو
نکل گئی ہے کہیں منہ چھپا کے آہ مری

۴

نہ واہ واہ مری اور نہ آہ آہ مری
وہ میر انجمِ سحر یہ شبِ سیاہ مری

جمالِ مہرِ محبت نے شاد کام کیا
مثالِ غنچہ تھی بیتاب ابتک نگاہ مری

۲۰ اگست ۱۹۳۹ء

بدرگاہِ ساقی

خمِ الست سے تھوڑی سی آبگینے میں
فروغِ طورِ تمنا ہو جس سے سینے میں

تری نگاہ کے میخانہ کی قسم ساقی
بغیرِ کیف نہیں کوئی لطف جینے میں

۲

تڑپ جگر میں نہ ہے اضطراب سینے میں
نظر خلا ہی خلا آ رہا ہے جینے میں

بجھی بجھی سی طبیعت نہ کیوں ہو اے ساقی
رہی ہے جام ہی میں کچھ نہ آبگینے میں

۳

جگر میں سوز ہی جب ہو نہ ساز سینے میں
کہاں سے لطف بھلا آئے ایسے جینے میں

کرم! کرم! نگہِ تشنہ لب پہ اے ساقی
ذرا سی جام میں اور بھر کے آبگینے میں

۴

مزا تو جب ہے یہاں میکشوں کے جینے میں
ہو ایک میکدہ آباد اپنے سینے میں

خموں کے خم ہوں دھرے سر بمہر گوشوں میں
لگی ہو میز پہ ساغر میں آبگینے میں

۲۸ر اگست ۱۹۳۹ء

بیتابی

بیتابیوں سے رد و کشش ہے جہات میں
بیتابیاں ہیں دامِ نظر کائنات میں

ہستی کے ذرّہ ذرّہ میں پنہاں سہی مگر
یہ جوہرِ لطیف ہے پیدا حیات میں

۲

نغموں کی موج بھی یہی مضراب بھی یہی
تعبیرِ خواب بھی ہے یہی خواب بھی یہی

جب "عقدۂ خموش" ہو نیرنگِ کائنات
کیوں کر نہ ہوں سوال کے آداب بھی یہی

۳

یہ روحِ کائنات جب آئی حیات میں
اک مہرِ نیم روز نکل آیا رات میں

فکر و نظر کا باب تھی اس کی کرن کرن
طوروں کی کوئی حد نہ رہی کائنات میں

۴

جانِ حیات ہیں یہی جانِ حیات ہیں
بیتابیاں ہی نام و نشانِ حیات ہیں

رگ رگ میں اپنی ان کو رچو کے آہیں!
بیتابیاں ہی تاب و توانِ حیات ہیں

۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء

غزل

ہے دل ہی فقط جگر نہیں ہے
شمشیر تو ہے سپر نہیں ہے

خالی ہے صدف گہر نہیں ہے
ہے آنکھ مگر نظر نہیں ہے

سر سر ہے ترا بغیرِ سودا
سودا جو ملا تو سر نہیں ہے

آہیں نہیں تیرے دل کی آہیں
جب ان میں کوئی اثر نہیں ہے

بے دانہ اُگے تو خاک سے کچھ
دانے میں اگر شجر نہیں ہے

جینے کو تو خواہشیں ہیں لاکھوں
مرنے کو جگہ مگر نہیں ہے

وہ یاس کی ہے ابھی شبِ تار
جس شب کی کوئی سحر نہیں ہے

۲۳ ستمبر ۱۹۳۹ء

زکات

قارون کی دولت سے نہ مرعوب ہو مومن! قاروں کی تباہی کے ہیں سامان اسی میں
جس ابر پہ دھوکا ہے تجھے ابرِ کرم کا پوشیدہ قیامت کے ہیں طوفان اسی میں

۲

بادل نہیں یہ ہے ہوسِ زر کا ہمالہ مانندِ قضا سر پہ جو یوں سایہ فگن ہے
مومن! تجھے دو دن ہی میں ہو جائیگا معلوم مٹی کی امانت ہے کہ قارون کا دھن ہے

۳

فرعون کا جادو کہ حکومت کہ سپاہی موسیٰ کے مقابل ہیں دھرے رہ گئے سارے
جس بحر میں موسیٰ کو امیں مل گیا رستہ فرعون کے اس میں ہی ستم بہ گئے سارے

۴

مومن! ہے ترا قلب ہی تیرا یدِ بیضا فرعونِ زمانہ کو ذرا ہاتھ دکھا دے
تکبیر تری چوبِ کلیمی کا بدل ہے جادو گرِ دوراں کے طلسمات مٹا دے

۲۵ ستمبر ۱۹۳۶ء

گرو بن گئی چار ہی دن میں چیلی

یہ بوجھی ہے اب آکے ہیں نے پہیلی　　　ملی شرق سے غرب کی جب سہیلی
حیا کی جگہ شوخ چشمی نے لے لی　　　گرو بن گئی چار ہی دن میں چیلی

بہو بیٹیوں کا اب اللہ ہی بیلی!

یہ مغرب کا جادو غضب تھا بلا تھا　　　پھرا آن کی آن میں رُخ ہوا کا
مہندر کہ مختار بیگم کہ شیلا　　　نہ منہ ہی سے بولی نہ سر ہی سے کھیلی

بہو بیٹیوں کا اب اللہ ہی بیلی!

سُکھی خود تھی اور ساک بہنوں کا سُکھ تھی　　　پتی ساس اور بھائی بہنوں کا سُکھ تھی
بہو کیا تھی گھر بھر کے نینوں کا سکھ تھی　　　رہا جب تلک اس کا مسکن حویلی

بہو بیٹیوں کا اب اللہ ہی بیلی!

نمائشِ سرِ راہ سیبِ ذقن کی　　　اداؤں کی ملبوس کی بانکپن

ہوا پھر گئی بوستانِ وطن کی جبھی ڈیلیاؔ بن گئی ہے چنبیلی
بہو بیٹیوں کا اب اللہ ہی بیلی !

کلی کھل کے اک نشاخسانہ ہوئی ہے نظر بازیوں کا بہانہ ہوئی ہے
حقیقت بگڑ کا فسانہ ہوئی ہے پہیلی یہ ہے عصرِ نو کی پہیلی
بہو بیٹیوں کا اب اللہ ہی بیلی !

ہوس رانیوں کا جہاں میں چلن ہے حسین آنکھ بیباک ناوک فگن ہے
یہی شاید اب مقصدِ حسنِ زن ہے دلِ ہر جواں ہو اور اس کی ہتھیلی
بہو بیٹیوں کا اب اللہ ہی بیلی !

مجسم وفا شرمگیں حورِ مشرق غیوروں کی دنیا و دیں حورِ مشرق
زنِ بہتریں تھی ایسی حورِ مشرق رہی جب تلک یہ حیا کی سہیلی
بہو بیٹیوں کا اب اللہ ہی بیلی !

۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء

؎۱ ڈیلیا ایک نہایت ہی خوش رنگ اور حسین پھول ہے مگر اس کی خوشبو گھناؤنی ہوتی ہے۔

غزل

نگاہیں بیقرارِ جلوہ کیوں ہیں؟ سراپا انتظارِ جلوہ کیوں ہیں؟
کہو خود اشتہارِ جلوہ کیوں ہو؟ نہ پوچھو ہم نثارِ جلوہ کیوں ہیں؟
شبابِ عشق پرور پوچھ ہم سے پرستارِ بہارِ جلوہ کیوں ہیں؟
نگاہِ خشمگیں تیری ہے محرم مرے دل میں شرارِ جلوہ کیوں ہیں؟
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پوچھ جگر میں جلوہ زارِ جلوہ کیوں ہیں؟
تمہاری خاکساری کا ہے دعوےٰ غبارِ رہگذارِ جلوہ کیوں ہیں؟

اثیر ہم ہیں یہ دنیا جانتی ہے
نہ پوچھو پردہ دارِ جلوہ کیوں ہیں؟

۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء

طلسمِ تضاد

مکالمہ

بندہ خدا سے

بندۂ تقدیر کہتے ہو کبھی — صاحبِ تدبیر کہتے ہو کبھی
تم کبھی آزاد کہتے ہو مجھے — بستۂ زنجیر کہتے ہو کبھی
میں کبھی صیّادِ یزداں گیر ہوں — اور مجھے نخچیر کہتے ہو کبھی
مجھ کو دیتے ہو لقب نقّاش کا — اور تمہیں تصویر کہتے ہو کبھی
ہوں کبھی میں ہی معانی آفریں — مجھ کو ہی تحریر کہتے ہو کبھی
نور کا ظلمت کبھی رکھتے ہو نام — زہر کو اکسیر کہتے ہو کبھی

اے کہ تیرے ذکر سے دل کی کشاد
کھول دے مجھ پر طلسماتِ تضاد

خدا بندے سے

پہلے اپنی ماہیت پر کر نظر　　تو نہیں ہے خاک ہی خاک اے بشر
خاک کے پُتلے نہیں مسئول تو　　تیری "بپتا" ہیں ترے فکر و نظر
پوچھتا ہے کون خالی سیپ کو　　دیکھتے یہ ہیں کہ ہے کیسا گہر؟
خاک کو تخئیل نے چمکا دیا　　ظلمتِ شب ہو گئی نورِ سحر
یہ جو ہیں "قیدِ مکاں" "قیدِ زماں"　　دسترس انکا ہے خالی خاک پر
جوہرِ تخلیق یعنی "امرِ رب"　　لامکانی چیز ہے اے بے خبر

اے "ابنِ امرِ رب" خاکی نہاد!
خود تری تخلیق ہے جمعِ تضاد

"لامکانی" جوہرِ آزاد ہے　　اور "مکانی" خوگرِ فریاد ہے
"لامکانی" "قمریِ فردوس" ہے　　اور "مکانی" "بستہ پا شمشاد" ہے
"لامکانی" ہے "ھدیناہ السبیل"　　اور "مکانی" صورتِ افتاد ہے

جس کو یزداں گبر کہتے ہیں ملک "لامکانی" ہی وہ اک صیاد ہے
صاحبِ تدبیر بھی نقاش بھی "لامکانی" "سلم یزل" کی داد ہے
فیضِ نورِ امرِ رب سے "اے امیں! منتِ گل تیری" "خیال آباد ہے

"گر شود پر نور روزن یا سرا
تو مداں روشن مگر خورشید را" مولانا روم

۱۵ / اکتوبر ۱۹۳۹ء

---

*

*

خاک بازی

یہ ماحول کس کا بنایا ہوا ہے؟ — مری روح پر کیوں یہ چھایا ہوا ہے؟
شکنجہ ہے نیرنگِ فطرت نہیں یہ — فریبِ تخیّل ہے صنعت نہیں یہ
چمن کیا ہے؟ اک دام ہے رنگ و بو کا — یہ را حال ہے "بلبلِ جستجو" کا
کھنچے جا رہے ہیں نگاہوں کے دامن — کہ گویا یہی خاک ہے ان کا مدفن
الجھ کر خس و خار میں رہ گئی ہے — نظر جھاڑ جھنکار میں رہ گئی ہے
زمیں کے تلے آسماں ڈھونڈتی ہے — حقیقت کو ظالم کہاں ڈھونڈتی ہے!
دلِ زار کی نو نیازی نے مارا! — نگاہوں کی اس "خاکبازی" نے مارا!
زر و زور کی راج دھانی بنی ہے — طلسماتِ دنیائے فانی بنی ہے

یہ فرعون گردی یہ قارون نگاہی
ٹلے گی بھی دنیا کے سر سے الٰہی!

۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

غزل

نے کا نے نام رکھ دیا کس نے؛   نے میں پیغام رکھ دیا کس نے؛

مختصر سی حیات میں جانے   اس قدر کام رکھ دیا کس نے

دل کی بیتابیوں کے عالم کا   زندگی نام رکھ دیا کس نے

پی رہا ہوں کہ پڑ گیا پینا   سامنے جام رکھ دیا کس نے

پر نکلتے ہی آشیانے میں   دانہ و دام رکھ دیا کس نے

پیرِ فانی تری نمازوں کا   حور انعام رکھ دیا کس نے

یہ حقیقت کا آئینہ ہے امینؔ
اس کا دل نام رکھ دیا کس نے

۲۳ اکتوبر ۱۹۳۹ء

زکات

دل میں ذوقِ امید پیدا کر
آنکھ میں شوقِ دید پیدا کر
جان کو ناصبوریاں سکھلا
خوئے "ھل من مزید" پیدا کر

۲

دل ملا وسعتِ نظر نہ ملی!
شب ملی ساعتِ سحر نہ ملی!
سیپ ساحل کی ہو رہی آخر
اس کو جب دولتِ گہر نہ ملی!

۳

بے خبر! وسعتِ نظر ہے بشر
گل نہیں جوہرِ بشر ہے بشر
جلوۂ کائنات بھی ہم سے
کہہ رہا ہے کہ "دیدہ ور" ہے بشر

۴

اے کفِ خاک! دیدہ ور ہو جا
شبِ تاریک سے سحر ہو جا
خودگری سہل ہے امینِ حزیں
صاحبِ فکر و خودنگر ہو جا

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء

زکات

زیست بے لذّتِ کردار فضول
چشمِ دل بے نگہِ پاک فضول

جس کی پلکوں پہ نہیں خونِ جگر
ہے وہی دیدۂ نمناک فضول

۲

حسن بے ذوقِ طلبگار فضول
جنس بے چشمِ خریدار فضول

ہے ترے ہاتھ میں فطرت کی نشست
دست بے لذّتِ کردار فضول

۳

حسن بے عشوہ و انداز فضول
عشق بے جذبۂ جانباز فضول

تیغ بے بازوئے بیباک عبث
بازِ بے جوہرِ پرواز فضول

۴

مرد بے ہمّتِ مردانہ فضول
رند بے جرأتِ رندانہ فضول

راکھ ہو کر نہ جو آخر کو اڑا
اے امینؔ ہے وہی پروانہ فضول

۲۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء

نقلِ کفر کفر نباشد

اک نود سالہ پیرِ دانش مند — کھا کے موئے سفید کی سوگند
کہہ رہا تھا یہ کل بحسرت و یاس — شرق کا ہو گیا ہے ستیا ناس
جس نے کی آ کے شرق کی تخریب — ہے وہ کمبخت مغربی تہذیب
کھا کے ایسی پچھاڑ بیٹھے ہیں — دین و دنیا لگاڑ بیٹھے ہیں
مردؔ نامردؔ اور زن "نازن" — نت نئی ٹیپ نت نیا فیشن
ہم سے چھینی گئی ہے فعالی — دیجے اس کے عوض میں نقالی
نقل سے عقل آ نہیں سکتی — نقل جدت سکھا نہیں سکتی
نقل میں ذوقِ انتقاد کہاں؟ — جرأت و تابِ اجتہاد کہاں؟
قوم وہ زندگی سے عاری ہے — جس میں مفقود "تازہ کاری" ہے

ع۱ "تازہ کاری" Initiative

مجھ سے کیا پوچھتے ہو اسکی مثال — بھیڑ پہنے ہوئے ہے شیر کی کھال
ہنس کی چال چل کے یہ کوے — ہائے اپنی بھی چال بھول گئے
مرد و زن مرد و زن رہے ہی نہیں — ایک جان اور دو تن رہے ہی نہیں
اصل ہیں ان کی زندگی ساری — عیش و عشرت کی ہے پرستاری
اک ہیولا ہیں نوجواں کیا ہیں — لکڑیاں ہیں یہ لڑکیاں کیا ہیں
نے بصارت ہے نے بصیرت ہے — ان کی صورت ہے اور نہ سیرت ہے
تتلیوں کی سے لئے ہیں رنگینی — ان میں آئے کہاں سے شاہینی
بوتلیں جو جہیز میں لائیں — اپنی پرچھائیں سے جو گھبرائیں
بچے جننے سے جو نفور رہیں — زچگی سے جو دُور دُور رہیں

جن چکیں وہ سپوت غیرت مند
شیر بھارت کے سورما فرزند

گو نود سالہ ہو گیا ہوں میں — میری آنکھیں بھی ہاتھ پاؤں بھی ہیں
کھیتی باڑی کا شغل ہے جاری — زندگی ہے مری زمینداری

میری ہم سن ہے میری گھر والی | پھر بھی چھپے ہے اسکے ہے لالی
گو یہ سرخی ہے "شام کی سُرخی" | پر نہیں "اہتمام کی سُرخی"
رنگ یعنی رہینِ غازہ نہیں | تندرستی کا یہ جنازہ نہیں

مرد ہے مرد اب نہ زن زن ہے!
اے امیںؔ دل کو سخت الجھن ہے!

۲ رنومبر ۱۹۳۹ء

غزل

زبانِ "لا" پہ ہے جاری پیامِ اِلّا اللہ
یہی مقام ہے سالک مقامِ اِلّا اللہ

ستارے ہوں کہ قمر ہو کہ مہرِ تاباں ہو
مری نگاہ میں سارے ہیں جامِ اِلّا اللہ

فضائے "لا" سے جو پرواز کر گیا اونچی
اسی ہما کا نشیمن ہے دامِ اِلّا اللہ

نہ کیوں فدا ہوں دل و جاں سے تجھ پہ اے ساقی
پلا دیا ہے مجھے تو نے جامِ اِلّا اللہ

یہ کائنات یہ فطرت کا پردۂ باریک
مری نگاہ میں ہے فیضِ عامِ اِلّا اللہ

شبِ حیات اُنہیں کی ہے بے نیازِ سحر
ہے جن کے سینے میں ماہِ تمامِ اِلّا اللہ

کمندِ "لا" کو ذرا پھینک کر تو دیکھ امیںؔ
تری پہنچ میں ہے لاریب بامِ اِلّا اللہ

۳ ر نومبر ۱۹۳۹ء

غزل

تحیّر فزا پردۂ رنگ و بُو ہے
ادھر میں ہی میں ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

مجھے دیکھتا ہے تو کیا میں نہ دیکھوں
ترے دیکھنے کی بڑی آرزو ہے

ستارہ سا جو اک ہے میری مژہ پر
مری خوں شدہ آرزو کا لہو ہے

یہی گریۂ پیہم صبحگاہی
مری چشم مشتاق! تیرا وضو ہے

تری ہی قسم ذرّے ذرّے کے لب پر
ترا تذکرہ ہے تری گفتگو ہے

پھڑک جائینگے جس کو سنکر فرشتے
ابھی میرا وہ نغمہ زیر گلو ہے

خلش ہے شب و روز پہلو میں جس کی
اسی کی امیںؔ رات دن جستجو ہے

۸ر نومبر ۱۹۳۹ء

نکات

بڑی ہی بات ہے گو دیدۂ ادراک کا ملنا
مگر کچھ اور ہے اے دل! نگاہِ پاک کا ملنا
مقامِ "علّم الاسما" اسی کا نام ہے ناداں!
یہ ملنا خاک کو ہے خلعتِ "لولاک" کا ملنا

۲

بڑی ہی بات ہے گو دیدۂ ادراک کا ملنا
مگر ملنا ہے ملنا مردمِ نمناک کا ملنا!
اسی گل سے بہارِ جاودانِ عشق ہے قائم
کہ ہے فردوس کا پتہ دلِ صد چاک کا ملنا

۳

بڑی ہی بات ہے گو دیدۂ ادراک کا ملنا
کہاں لائے "ما و طین" لیکن ضمیرِ پاک کا ملنا
کھٹک دل کی نہ جب تک دل کو وقفِ جستجو کر دے
ہے ناممکن سراغِ فطرتِ چالاک کا ملنا

۴

بڑی ہی بات ہے گو دیدۂ ادراک کا ملنا
مگر کچھ اور ہی ہے جرأتِ بیباک کا ملنا
بغیر اسکے خودی کی زندگی رہتی ہے خطرے میں
ایسی جرأت کا ملنا اسکو ہے تریاک کا ملنا

۱۰ نومبر ۱۹۳۹ء

معارف

حسن کی قدر کرے چشمِ ہوس ناممکن
شمع کے پاؤں پہ گر جائے مگس۔ ناممکن
غوطہ زن کب یمِ ہستی میں ہوئے مستِ نمود
گوہر اندوز ابیں ہو کفِ خس۔ ناممکن

۲

حسن ہے بادۂ رنگینِ ازل عشق سرور
نور ہی نور ہے وہ اور یہ ہے طور ہی طور
حسن اک جلوۂ جاوید ہے بے قیدِ حیات
عشق اک دیدۂ حیرت زدہ بے غیب و حضور

۳

حسن کی عشق ہے ضد عشق کی ضد حسنِ جمیل
کوئی دعوےٰ نہیں موجود نہ ہو جس کی دلیل
اے کفِ خاک یہ ہے خود تو بھی طلسماتِ تضاد
"تن" تو آذر ہے ترا اور ترا "من" ہے خلیل

۴

اہرمن کب ہوا یزداں کے تخیل سے الگ
ذہن میں بھی نہ کبھی خار ہوا گل سے الگ
واعظِ شہر کے ہمدوش ہے رندوں کا خیال
جس طرح صورتِ خمیازہ نہیں مل سے الگ

۱۳ر نومبر ۱۹۳۹ء

التجا بدرگاہِ ساقی

نور ہی نور ہے جو شے وہ ملے! شعلۂ طور ہے جو مے وہ ملے!
لڑکھڑائے نہ جس سے پائے ثبات جام پر جام پے بہ پے وہ ملے

۲

نور کی پی کے نور ہو جاؤں! شعلۂ کوہِ طور ہو جاؤں!
مے وہی مانگتا ہوں اے ساقی! جس سے خود بھی "سرور" ہو جاؤں!

۳

مستیاں ہوں مری نگاہوں میں! کیف ہو میری سرد آہوں میں!
میرے آنسو ہوں بادۂ سرجوش "کوثریت" مرے گناہوں میں!

۴

مئے باقی کا جام مل جائے! زندگیٔ دوام مل جائے!
قیدِ صبح و مسا سے چھوٹ جاؤں "لامکانی" مقام مل جائے!

۲۳ نومبر ۱۹۳۹ء

غزل

خوش نہیں درد سے جو عشق کا دعوےٰ نہ کرے
ہوش کھونے ہوں تو جلووں کا تقاضا نہ کرے

آتشِ شوق نہیں آتشِ نمرود سے کم
آگ کا ڈر ہو تو بت خانہ پہ دھاوا نہ کرے

ایک آواز سے کھل جاتا ہے سب ڈھول کا پول
دولتِ عشق میسر ہو تو غوغا نہ کرے

رند وہ معتکفِ کعبۂ ہستی ہے کہ جو
زائرِ دیر نہ ہو عزمِ کلیسا نہ کرے

حسن وہ حسن ہے جو عشق کی رمزیں سمجھے
عشق وہ عشق ہے جو حسن کو رسوا نہ کرے

غم جسے کہتے ہیں وہ خونِ تمنا ہی تو ہے
اس سے بچنا ہو کسی کو تو تمنا نہ کرے

ہم تو کہتے ہی رہینگے دلِ مردہ سے ابیںؔ
خود اگر جی نہ سکے منتِ عیسیٰؑ نہ کرے

۵ر دسمبر ۱۹۳۹ء

غروبِ آفتاب

زرد روئے آفتابِ مغرب کا ‏ منظرِ بے بسی ہے قابلِ دید
دفن کرنے کو اپنے کندھوں پر ‏ لے چلے اہلِ کوفہ نعشِ یزید

۲

خونِ ناحق شہید کا آخر ‏ کس قیامت کا رنگ لایا ہے
عہدِ زرّینِ مہر ختم ہوا ‏ ماہ و انجم کا دور آیا ہے

۳

ہے مکافات کا عمل جاری ‏ آسمانوں میں اور زمینوں میں
پی رہا ہے جو آج اسی کا خون ‏ کل پڑا ہو گا آب گینوں میں

۴

نشہ آور سہی مئے بیداد ‏ زہرِ قاتل بھی ہے یہ یاد رہے!
جنکی بھی بستۂ جفا تھی امید ‏ آخرِ کار نامراد رہے

۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء

نکات

جو خونِ جگر رکھتا ہے آہیں نہیں کرتا
رو رو کے خودی سوز کراہیں نہیں کرتا
ڈٹ جاتا ہے سورج کے مقابل میں بھی تن کر
ہو کچھ بھی مگر نیچی نگاہیں نہیں کرتا

۲

ہو خونِ جگر جس میں وہی ہوتا ہے خود گر
جوہر کا یہی وصف ہے رہتا نہیں دب کر
"قوت" کی یہ منطق ہے کہ غلبہ ہو "مرا حق"
اور فلسفہ کمزور کا "تقدیر و مقدر"

۳

وہ سوزِ جہاں تاب ہے اس خونِ جگر میں
موجود جو انجم میں ہے نے شمس و قمر میں
ہے اُن کے رگ و پے میں یہی جوہرِ بیباک
اک عزم کی دنیا ہے بسی جن کی نظر میں

۴

دیکھا بھی کبھی تو نے تجسس کی نظر سے
رنگینیٔ عالم ہے اسی خونِ جگر سے
ہر قطرہ ہے اس خون کا اک "قلزمِ امکاں"
جو خاک پہ ٹپکا نہ ابھی دیدۂ تر سے

---

۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء

غزل

جی کا وظیفہ تیری تمنّا نینوں کا کاجل نورِ تجلّٰی
تیرا تصوّر تسکینِ خاطر تیرا تخیّل فطرت کا منشا
ہستی کی ہر شے آنکھیں ہی آنکھیں اور بالمقابل جلوہ ہی جلوا
پردہ بھی ہے اور بے پردگی بھی یہ بھی معمّا وہ بھی معمّا
خاموش رہنا کیوں سازِ ہستی مضراب تیری ہے کارفرما
عشق و محبّت کی داستاں ہے ہستی کو میں نے ایسا ہی سمجھا

حیرت کی مورت ہر صاحبِ دل
جانے ابھی یہ ہے کیا تماشہ!

۱۴ر دسمبر ۱۹۳۹ء

زکات

عشقِ در و بام ہے سنبھل کر
دنیا نہیں دام ہے سنبھل کر
تو جس پہ سوار ہے وہ رہوار
بے زین و لگام ہے سنبھل کر

۲

ہر گام پہ دام ہے سنبھل کر
مستی کا پیام ہے سنبھل کر
ہے پختہ شرابِ نابِ فطرت
اور تو ہے کہ خام ہے سنبھل کر

۳

بلبل! بسرِ شام ہے سنبھل کر
دانہ تہِ دام ہے سنبھل کر
صیّاد ہے گھات میں خبردار!
تعجیل حرام ہے سنبھل کر

۴

دانہ نہیں دام ہے سنبھل کر
آفت کا پیام ہے سنبھل کر
قینچی نہ چلائیے زباں کی
"باتیں" نہیں "کام" ہے سنبھل کر

---

۱۷ دسمبر ۱۹۳۹ء

غزل

زندگی کی بہار دیکھتے ہیں — گل کے پہلو میں خار دیکھتے ہیں

جلوہ گر ہیں وہ خشمگیں ہو کر — نور کے ساتھ نار دیکھتے ہیں

جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے — جلوۂ روئے یار دیکھتے ہیں

پیار ہوتا ہے جس سے اے پیارے! — اس کو ہی بار بار دیکھتے ہیں

ہم سمجھتے ہیں اس کو اپنا ہی — جس کی آنکھوں میں پیار دیکھتے ہیں

دختِ رز کی ہیں شوخیاں قبلہ! — جُبّۂ داغدار دیکھتے ہیں

کیا یہی دل ہے؟ جس کو پہلو میں
ہم امیںؔ بے قرار دیکھتے ہیں؟

۲۰ر دسمبر ۱۹۳۹ء

بدیہات

مسلم کا مقام کھو گیا ہے! دن ہے ابھی اور یہ سو گیا ہے!
سوتوں کو جگانیوالا سو جائے کچھ اس کو ضرور ہو گیا ہے!

۲

دنیا کو خودی سکھانے والے! ظلماتِ حیات کے اجالے!
میدانِ عمل کے مردِ غازی! تو اور جہاں میں منہ کی کھالے!

۳

تو اور ذلیل ہو جہاں میں! لگ جائیگی آگ آسماں میں
عالم کی بلندیوں کے حقدار! دبکا ہوا کیوں ہے آشیاں میں

۴

توحید کے خاورِ جہاں تاب! خم خانۂ دہر کی مئے ناب!
اے بحرِ عمیقِ زندگانی! ظاہر ہے کہ تو ہوا ہے پایاب

۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء

مقامِ مردِ مومن

مردِ مومن کا ہے مقام الگ — مہرِ وحدت کا ہے نظام الگ
اس خدامست رند کی واللہ — مے الگ خم الگ ہے جام الگ

۲

مردِ مومن کا ہے مقام الگ — قصرِ توحید کا ہے بام الگ
مردِ مومن کی اپنی دنیا ہے — صبح جس کی الگ ہے شام الگ

۳

مردِ مومن کا ہے مقام الگ — اس کا دنیا کو ہے پیام الگ
آسمانی فضاؤں کا عنقا — اس کا دانہ الگ ہے دام الگ

۴

مردِ مومن کا ہے مقام الگ — اس مئے تند کا ہے جام الگ
اس کی مسجد حریمِ حریت — مردِ مومن کا ہے امام الگ

۳ر اپریل ۱۹۴۶ء

تربتِ پیرِ ہندی

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

جبیں میری نگاہیں ہو رہی ہیں
دعائیں سرد آہیں ہو رہی ہیں
عقیدت کا چڑھاوا چڑھ رہا ہے
غلافِ قبر باہیں ہو رہی ہیں

۲

لحد میں مردِ مومن سو رہا ہے
نزولِ رحمتِ حق ہو رہا ہے
عقیدت پیرِ ہندی سے ہے کتنی!
کہ جو زائر ہے دل سے رو رہا ہے

۳

میں کس دردآشنا کی قبر پہ ہوں
کہ محوِ لذتِ دردِ جگر ہوں!
نئے عالم کے نظارو میں ہوں گم
الٰہی میں بھی کیا اہلِ نظر ہوں!

۴

کھنچا ہے گردِ تربت حلقۂ نور
یہی موسیٰ منش مردوں کا ہے طور
بزرگوں کی زیارت کر رہا ہوں
وہ رومیؒ ہیں وہ افغانیؒ وہ منصورؒ

۴ اپریل ۱۹۶۸ء

۱ مولانا روم رحمۃ اللہ ۲ مولانا جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ

غزل

ظلماتِ ممکنات میں چھپنے کا گیا ہو دل	جانے خضر کہ چشمۂ آبِ بقا ہے دل

فطرت ہے اس ہی اور یہ فطرت میں خود نما	کیا جانیں وہ ہے آئینہ یا آئینہ ہے دل

ارض و سما میں دھاک ہے جسکی یہی تو ہے	لاریب مشتِ خاک! ترا ہی بلا ہے دل

اس کا اک ایک قطرہ ہے طوفاں دربغل	معمور تجلیوں سے ہے جو وہ گھٹا ہے دل

سمجھے ہوئے ہوں میں تو یہی اسکی ماہیت	اک حسنِ لاجواب کی رنگیں ادا ہے دل

اک اہلِ دل نے کیا ہی تیکھی کہی ہے بات	حق دار دل کا ہے وہی جس نے دیا ہے دل

یہ کائنات آئنہ خانہ ہے اور امیں

مجبوریوں کے زیرِ اثر خود نما ہے دل

۵؍ اپریل ۱۹۴۰ء

غزل

اِک برق ہے، ہجومِ تقاضا لئے ہوئے
جانے میں آ گیا ہوں یہاں کیا لئے ہوئے

محمل کی اوٹ میں لبِ لیلیٰ شفق فروش
دشتِ جنوں میں قیس ہے، غوغا لئے ہوئے

اک تو کہ بے حجاب نہ ہونا تری ادا
اک میں کہ شوقِ دید کی دنیا لئے ہوئے

اک تو کہ اپنے حسن کی ہے آپ ہی دلیل
اک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لئے ہوئے

اک تو کہ تیری مست نگاہوں میں میکدے
اک میں کہ لب پہ حسرتِ صہبا لئے ہوئے

مقصود امتحان ہے رندوں کے ظرف کا
پھرتا ہوں بزم بزم میں مینا لئے ہوئے

اتنا اثر تو شیخ کی صحبت کا ہے امیںؔ
ہاتھوں میں جام لب پہ ہوں توبہ لئے ہوئے

۵؍اپریل ۱۹۴۳ء

غلط نامہ

صفحہ	حوالہ	غلط	صحیح
۱۰	مقامات بند سوئم	بن ہی کے	بن کے ہی
۱۳	فٹ نوٹ	ڈُرر	درر
۲۷	مقطع	غماص	غماز
۲۹	بند دوئم	آب ودانے	آب دانے
۳۳	مطلع	رہ	راہ
۵۵	بند پنجم	کا مینا	کی مینا
۵۸	غزل کا چوتھا شعر	بزلہ سنجی	بذلہ سنجی
۶۱	چھوتھا شعر	نا چکید	نا چکیدہ
۶۶	بند چوتھا دوسرا مصرع۔	رہنے دیجئے	بہنے دیجئے
۷۷	بند چوتھا	مقصود ہو چکا ہے	مفقود ہو چکا ہے
۷۸	بند اول چوتھا مصرع	ہیں	×
۸۳	بند سوئم چوتھا مصرع	بقائے دوام	بقا و دوام
۸۸	بند اوّل مصرع اوّل	مجبوریاں	معذوریاں
۹۸	بند دوئم دوسرا شعر	دفتر سے	دفتر تھے
۱۰۸	بند چہارم	روپوش وہ	روپوش ہو وہ
۱۱۳	سطر سوئم	رکھ عطر خاص ابد	رکھ عطرِ خاصِ ابد
۱۱۴	〃 اوّل	نبار	نیاز

صفحہ	حوالہ	غلط	صحیح
۱۱۷	تیسرا بند	معشوق عاشق	معشوق و عاشق
۱۱۸	بند دوئم	مظہر	منظر
۱۲۰	پہلے اور دوسرے بند کے ٹیپ کے مصرعوں میں 'ہے' کی بجائے 'ہیں' پڑھیئے۔	ہے	ہیں
۱۳۲	پانچواں شعر	میری	مری
۱۳۵	بند پنجم	شیر	شیر
۱۳۹	بند دوئم	بررا	بروا
۱۴۳	سطر چھٹی	ہوئی	ہوائی
۱۴۴	" دوئم	نظّارہ	نظارہ
۱۵۵	مطلع	ذراسی ذرا	ذراسا ذرا
۱۷۴	آخری شعر دوسرا مصرع	بانکپن	بانکپن کی